موہنی حمید کے ریڈیائی ڈرامے

کھلتے ہیں پھول کتنے کم



موہنی حمید

ڈرامے

کھلتے ہیں پھول کتنے کم

موہنی حمید

شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز

لاہور ، حیدرآباد ، کراچی

جملہ حقوق محفوظ

طابع : شیخ نیاز احمد
مطبع : علمی پرنٹنگ پریس لاہور
قیمت : تین روپے

مقام اشاعت :
شیخ غلام علی اینڈ سنز۔ پبلشرز
ادبی مارکیٹ۔ چوک انارکلی لاہور

ترتیب :

اُن بے شمار سننے والوں کے نام
جنھیں میری آواز پسند ہے!

مائیکروفون کا پیٹ بھرتے بھرتے فن کار چاہے خود تھک جائے اس کا پیٹ کبھی نہیں بھرتا۔

میں ریڈیو کی طویل زندگی میں مائیکروفون سے اس قدر مانوس ہو گئی ہوں کہ اب یہ مجھے دھات کا بنا ہوا ایک آلہ نہیں بلکہ ایک کردار محسوس ہوتا ہے۔ اس نے مجھے ہر ہر روپ میں دیکھا ہے اور میرے کون کون سے روپ، میرے سننے والوں تک پہنچا چکا ہے، میں جب سوچتی ہوں تو گم سم سی ہو جاتی ہوں۔

میں — اور — میرے اتنے سارے روپ!

میں ہر کردار میں کھو چکی ہوں۔ میری زندگی نئے نئے کردار کی تلاش میں کھو سی گئی ہے۔ میں ان کرداروں کو صدائیں دے رہی ہوں اور ان صداؤں میں محض ایک آواز بن کر رہ گئی ہوں — آواز! جو ایک دفعہ منہ سے نکل کر پھر واپس نہیں آتی۔ فضاؤں میں کھو جاتی ہے۔ سنا ہے ایک منٹ میں اسّی دفعہ ساری دنیا کے گرد گھوم جاتی ہے۔

جب میں کوئی خوب صورت سا کردار ادا کرتی ہوں تو بعد میں اکثر سوچتی ہوں کہ فلاں فقرہ یوں نہیں یوں بولنا چاہیے تھا۔ یہاں ہنسی چاہیے تھی۔ یہاں صرف مسکراہٹ۔ سننے والے تعریف کرتے ہیں لیکن میں ایک نامکمل سے اطمینان کے تاثّر میں ڈوب جاتی ہوں۔ یہی ایک تاثّر ہے جو کبھی کبھی قلم اٹھانے پر بھی اکساتا ہے۔ میں نے ریڈیو کے لیے بہتیرا لکھا لیکن یہ جو کچھ پیش کر رہی ہوں یہ اس ڈھیر میں سے چند نمونے ہیں ان تمام کی اساس ڈرامہ ہی ہے۔ سب کردار ڈرامہ بولتے ہیں لیکن میں نے ڈرامہ

کے وسیع کینوس کو مدِنظر رکھتے ہوئے انھیں چار حصوں میں تقسیم کر لیا ہے۔ ریڈیو پر جدید ڈرامے پیش کرنے کے یہ چار انداز سمجھ لیجیے۔

"کھلتے ہیں پھول کتنے کم" — ایک فرانسیسی کہانی کا تاثر ہے۔ یہ میں نے خاص طور پر خود بولنے کے لیے لکھا تھا۔ اس کا انداز روایتی ڈرامے سے ہٹ کر ہے۔ اس میں زیادہ تر ایک ہی کردار بولتا ہے لیکن اسے ماحول کے صوتی اثرات سے یوں سجایا گیا ہے کہ سننے والا اس کیفیت میں ڈوب کر رہ جاتا ہے اور ایک ہی کردار کا بولنا ذہن پر بار نہیں گذرتا۔

اس مجموعہ کی آخری کوشش "میرا وعدہ" میں کردار کم سے کم لفظ بول کر سب کچھ کہہ جاتے ہیں۔ لفظوں کی بندش خاص ریڈیائی بندش ہے۔

"ساون" — ایک فیچر ہے۔ یہی وہ موسم ہے جب توبہ کی خیر نہیں ہوتی۔ دیوانے تو دیوانے، ہوشیار بھی بہکنے لگتے ہیں۔ کرداروں کے ساتھ ساتھ ماحول کی خوب صورتی اجاگر کرنے کے لیے راوی کا سہارا لیا گیا ہے۔

"پردیسی" اور "خون اور مہک" دونوں ہی روایتی ڈرامے ہیں۔ "پردیسی" کی کہانی کے کرداروں میں محبّت سے زیادہ انسانی ہمدردی ہے جبکہ "خون اور مہک" کا موضوع عام ڈراموں کی طرح محبّت ہے لیکن یہ محبّت روایتی نہیں اس کا انداز جداگانہ ہے۔ سلیم، شمی کو چاہتا ہے اور شمی مہک کو —

اس کتاب کے مندرجات سننے والوں سے تو داد پا چکے ہیں۔ اب امید ہے پڑھنے والے بھی ان سے محظوظ ہوں گے۔ اللہ کرے میری یہ کوشش آپ کو پسند آئے۔

موہنی حمید

لاہور

۱۵ مارچ ۱۹۷۴ء

گردشِ ایّام کی ہوں بازگشت
ہُوں فقط آواز ہی آواز ہیں

موہنی حمید

کھِلتے ہیں پھُول کتنے کم

(ڈرامہ)

کردار

مَیں
اور : دو نوجوان لڑکیاں
میری سہیلی سیما

وہ : دل کش آواز کا مالک ایک نوجوان

چند دیگر آوازیں
اور
کردار

سہیلی : تم نے مجھ سے آج تک کوئی بات نہیں چھپائی۔

مَیں : ہاں! لیکن اب کون سی بات ہو گئی ہے!

سہیلی : ابھی تم مجھ سے جھوٹ بولو تو دوسری بات ہے ورنہ ۔ ۔ ۔"

مَیں : تم تو خواہ مخواہ مُصِر ہو، کوئی بات نہیں۔

سہیلی : یہ تو نہ کہو۔ میں تمھیں پہلے سے بالکل مختلف پاتی ہوں تم اتنی کم گو نہ تھیں۔ رقص تمھاری ہابی تھا لیکن اب ریسٹوران میں خاموش بیٹھی رہتی ہو۔ خاموش چپ چاپ۔ جیسے تمام دنیا کی خاموشیاں تم نے سمیٹ رکھی ہوں۔

مَیں : (ہنستی ہے)

سہیلی : ہاں تم مجھ پر ہنسو لیکن تم مجھ سے چھپا کچھ نہیں سکتیں۔ اپنے منہ سے نہ بتاؤ گی تو خود ہی مجھے کسی نہ کسی دن معلوم ہو جائے گا۔

مَیں : بھئی سچ مچ تم تو SERIOUS ہو رہی ہو۔

سہیلی : SERIOUS ہونے کا مجھے حق جو ہے۔ دس برس سے ہم اکٹھے رہے ہیں۔ کالج سے لے کر آج تک، اب ملازمت بھی ملی ہے تو اکٹھی، پھر ایک ہی گھر میں رہنا، کھانا، پینا۔ ہر جگہ پر ہم دونوں اکٹھے ہوتے تھے، لیکن اب تم ہر روز رات کو غائب ہو جاتی ہو، اور اکیلی جانا پسند کرتی ہو — آخر یہ سب تبدیلیاں مجھے محسوس نہیں ہوتیں؟

مَیں : میں یکایک کچھ زیادہ سنجیدہ ہو گئی ہوں۔

سہیلی : اور اسی وجہ سے مَیں پوچھ رہی ہوں۔
مَیں : (ٹھنڈا سانس) وہ جو یوں چاہتا ہے۔
سہیلی : ہاں! اب راستے پر آئیں۔ یہی تو میں کہتی تھی کہ کوئی نہ کوئی "وہ" ضرور ہے۔
مَیں : وہ — ہاں وہ تو کوئی نہیں۔
سہیلی : اوہو — تو معاملہ یہاں تک پہنچ چکا ہے کہ اب نام لے کر بھی چھپایا جا رہا ہے۔
مَیں : تم مذاق اڑانا چاہتی ہو؟
سہیلی : توبہ توبہ، یہ جرأت مَیں کر سکتی ہوں۔ ہاں! تو کچھ اتا پتا تو بتاؤ کون ہے وہ!
مَیں : مَیں اس کا نام نہیں جانتی۔
سہیلی : ہائیں — نام بھی نہیں جانتیں، تو پہل ضرور تمھاری طرف سے ہوگی۔
مَیں : یہ کیسے تم نے جانا —!
سہیلی : بھئی دیکھتے ہی لٹّو ہو گئی ہوں گی اور نام پوچھنے کی فرصت نہ ملی ہوگی۔
مَیں : نہیں! ایسا تو نہیں ہے۔
سہیلی : اچھا تو پھر خود ہی بتا دو۔ کہاں رہتا ہے وہ۔ تم سے ملاقات کیسے ہوئی؟
مَیں : میری اس کی ملاقات بھی نہیں ہوئی۔
سہیلی : پھر تمھارا دماغ ضرور خراب ہو رہا ہے۔ نام بھی نہیں معلوم۔ ملاقات بھی نہیں ہوئی اور یکایک تمھاری زندگی ہی بدل رہی ہے کہیں خواب

میں تو نہیں فریفتہ ہو گئیں ؟

میں : نہیں خواب تو نہیں تھا لیکن اب وہ میرے خوابوں میں رہنے لگا ہے۔ اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے اب اس کی صورت میری نگاہوں میں گھومتی رہتی ہے۔

سہیلی : تم تو بہت زیادہ جذباتی ہو رہی ہو۔ مجھے بتاؤ، شاید میں تمھاری مدد کر سکوں۔ کون ہے وہ ! تم سے کہاں ملا تھا، یا، تم نے اسے کہاں دیکھا ہے ؟

میں : اسی ریسٹوران میں۔ وہ ایک میز پر تنہا، خاموش اور اداس بیٹھا تھا میں نے اس کی موجودگی کو فوراً محسوس کر لیا۔ کیونکہ وہ دوسروں سے مختلف تھا۔

سہیلی : اچھا — کیا بہت ہی خوب صورت تھا۔

میں : اسے حسین تو نہیں کہا جا سکتا مگر وہ اس سے بھی کچھ زیادہ بھلا معلوم ہوتا تھا۔ عام نوجوانوں سے جدا حیثیت کا مالک ہے۔ اس کے بالوں میں عجیب سی چمک تھی۔ جب وہ بالوں پر ہاتھ پھیرتا تو . . . . .

سہیلی : تم نے میرے دل میں بھی خواہش پیدا کر دی اسے دیکھنے کی۔

میں : تم مایوس نہ ہو گی۔ اس میں ایک عجیب کشش ہے۔ اس کو دیکھ کر کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہم اسے صدیوں سے جانتے ہیں اور کبھی جیسے وہ بالکل اجنبی ہے۔ میں اسے صحیح معنوں میں نہیں جانتی مگر مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ میرا ہو چکا ہے۔ وہ مجھ سے مخاطب بھی نہیں ہوا مگر جس انداز سے وہ مجھے دیکھتا ہے اس سے میں اچھی طرح جان گئی ہوں کہ وہ مجھ میں دل چسپی ضرور لے رہا ہے۔

سہیلی : خدا کرے تمھارا خیال درست ہو لیکن پھر بھی تمھیں اس قدر جذباتی

نہیں ہونا چاہیے۔ تم نے رقص کرنا بھی چھوڑ دیا ہے۔ ریسٹوران میں تمھاری دھوم تھی لیکن اب تم خاموش بیٹھی رہتی ہو۔

میں : جب وہ میری طرف دیکھتا ہے تو مجھے رقص اور موسیقی سے جیسے نفرت ہو جاتی ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہیں کھلی فضا میں اس کے ساتھ خاموش اور پرسکون بیٹھ جاؤں، نہ وہ بولے نہ میں۔ بس صرف ایک دوسرے کو دیکھیں دیکھتے رہیں زندگی بھر، اس کائنات کی گردش وہیں رک جائے۔ وقت ہمیشہ کے لیے اسی جگہ ٹھہر جائے۔

سہیلی : توبہ توبہ مجھے تو تصور میں بھی کبھی یہ خیال نہ آیا تھا کہ ایک کھلنڈری اور چلبلی لڑکی اتنی حساس بھی ہو سکتی ہے۔ تم تو شاعروں سے بھی بڑھ گئیں۔

میں : مجھے خود اپنی حالت پر ہنسی آنے لگتی ہے لیکن تم سے میں کبھی کچھ چھپا نہیں سکتی۔ جب اس کی نگاہیں میری طرف اٹھتی ہیں تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ مجھے خاموش دیکھنا پسند کرتا ہے اور میں بولتے بولتے رک جاتی ہوں اور اور پھر وہ مسکرا دیتا ہے۔

سہیلی : لیکن تم اس سے بات تو کر کے دیکھو۔ یوں آنکھوں آنکھوں میں تو زندگی نہیں گزر سکتی نا! پتہ نہیں وہ کون ہے! شادی شدہ بھی ہو سکتا ہے۔

میں : نہیں۔ میں نے اسے ہمیشہ اکیلا ہی دیکھا ہے۔ اس نے کسی لڑکی کو کبھی اپنے ساتھ میز پر بیٹھنے کی دعوت نہیں دی۔ مجھے وہ ضرور بلائے گا۔

سہیلی : تم نے خود بھی اس سے ملنے کی کوشش نہیں کی؟

میں : ایک دفعہ اس کی توجہ اپنی طرف کرنے کے لیے میں ذرا بلند آواز

میں ہنسی تو اس نے اپنا منہ اس انداز سے دوسری طرف پھیر لیا کہ مجھے شرم آ گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے میں کوئی جرم کر بیٹھی ہوں اور اس دن سے ہنسی میرے لبوں سے رخصت ہو گئی۔ اگر میں ہنسنا بھی چاہوں تو ایسا محسوس ہو گا جیسے زخم اپنا منہ کھول دے۔

سہیلی : تم نے مجھ سے ساری باتیں چھپائے رکھیں۔

میں : میں اس محبّت کو گناہ کی طرح چھپانے لگی ہوں۔ مجھے شرم محسوس ہوتی ہے۔ لیکن کیا کروں اس کا خیال، اس کی صورت ہر وقت میرے خوابوں میں میرے ذہن میں چھائی رہتی ہے۔

سہیلی : کتنے عرصے سے تم اس ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو ؟

میں : آج پورے آٹھ دن ہو گئے ہیں۔ صرف دو دن میں ریسٹوران میں نہیں گئی لیکن چھ دن وہ وہیں اسی میز پر جیسے صرف مجھے دیکھنے کو بیٹھا رہتا اسی طرح بیگانہ وار، خاموش، تنہا۔

سہیلی : اگر یہ تمھارا وہم ہی ہو تو ؟

میں : میں اپنے دل سے یہ سوال بار بار کر کے ہار چکی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ میری شکل میں کشش ضرور ہے لیکن ایسی اور بھی کئی لڑکیاں ہیں۔ اگر اسے مجھ سے کوئی لگاؤ نہیں ہے تو وہ اس انداز سے کیوں دیکھتا ہے (تیز) آخر وہ مجھ سے کیا چاہتا ہے !

سہیلی : بعض مردوں کو ہم جیسی نا تجربہ کار لڑکیوں کو ستانے میں لطف آتا ہے۔

میں : مگر میرا دل نہیں مانتا کہ وہ ایسی حرکتوں سے حظ اٹھا سکتا ہے۔ میں تو صرف یہ جانتی ہوں کہ مجھے اس سے محبّت ہے اور وہ بھی مجھے . . . . .

سہیلی : یہ تم یقین سے نہیں کہہ سکتیں۔

مَیں : مجھے ایسا لگتا ہے جیسے ہمارے درمیان ایک سمجھوتا، ایک معاہدہ، ہو چکا ہے جس سے مضبوط دوسرا کوئی رشتہ نہیں ہو سکتا۔

سہیلی : یہ تم ہی محسوس کرتی ہو نا۔

مَیں : محبت میں احساس تیز اور گہرا ہو جاتا ہے۔

سہیلی : تم ہمیشہ اس کی توجہ کی منتظر رہیں!

مَیں : ہاں! اگر وہ میری قوتِ برداشت ہی پرکھنا چاہتا ہے تو مَیں اس کے لیے بھی تیار ہوں۔

سہیلی : یوں تذبذب میں دن بتانے سے فائدہ؟

مَیں : اگر یہ معاملہ اتنا سنجیدہ نہ ہوتا اور اگر مجھے اس کا خیال ہر وقت نہ ستاتا رہتا تو مَیں اس کے جذبات کا اندازہ لگا سکتی تھی۔

سہیلی : اچھا اب اس خیال کو اپنے اوپر اور زیادہ طاری نہ کرو۔ اٹھو دفتر کا وقت ہو رہا ہے۔ آج شام رسیٹوران میں جائیں گے پھر تم خود سے بات کرنا۔

مَیں : اوہو۔ باتوں میں خیال ہی نہ رہا۔ یہ میری APPLICATION لے جانا۔ مَیں آج دفتر نہیں جاؤں گی۔

سہیلی : دفتر نہیں جاؤ گی تو یہاں اکیلی کیا کرو گی! چلو اٹھو، خواب کی دنیا کو چھوڑو۔

مَیں : تم نہیں جانتیں ٹائپ کرتے وقت بھی مجھے اسی کی صورت دکھائی دیتی ہے۔ ویسے رات مَیں سو بھی نہیں سکی اس لیے یہ APPLICATION تم لے ہی جاؤ — لے جاؤ گی نا!

سہیلی : اچھا تم تیار رہنا شام تمھیں لے کر رسیٹوران جاؤں گی۔ ذرا جلدی

چلیں گے۔ آج جگہ مشکل ہی سے ملے گی۔ یاد ہے پچھلے کرسمس پہ بھی کھڑے رہے تھے۔

میں : ہاں آج تو خوب ہنگامہ ہوگا۔ رات بارہ بجے تک لوگ ہلڑ مچائیں گے۔

(موسیقی)

سہیلی : ہاں تم تیار رہنا۔ میں جاتی ہوں۔

میں : آج شام میں کتنی اداس ہوں۔ میں کچھ کھا بھی نہیں سکی۔ شاید یہ حقیقی مسرت ہے جس کی میں عادی نہیں۔ مجھے اس مسرت اور غم میں فرق محسوس نہیں ہوتا۔

(ہلکی بارش کا شور دور سے)

اوہ بارش ہونے لگی۔ کھڑکی میں سے باہر دیکھوں.... میں اپنے دریچے میں کھڑی باہر دیکھ رہی ہوں۔ کچھ دیر بعد سیما مجھے لینے آئے گی۔ کتنی پیاری سہیلی ہے میری۔ کتنا فکر کرتی ہے میرا.... مجھے باہر جانے کے لیے تیار ہوجانا چاہیے لیکن میں تو جیسے کھوئی سی گئی ہوں۔ عجیب اداسی کی حالت میں بارش کو دیکھ رہی ہوں۔ بارش گھر کی طرح مغموم ہے۔ کبھی وہ وقت تھا کہ میں بارش کے منظر کو پسند کرتی تھی۔ بجلی کی چمک اور کڑک مجھے بھلی معلوم ہوتی تھی۔ اب مجھے کالی گھٹاؤں میں بگلوں کی قطار ہی اچھی لگتی ہے۔

(بارش — بادل)

پُر ہجوم بازار میں پھرنا مجھے پیارا لگتا تھا۔ ریسٹوران میں جب موسیقی کی پہلی دُھن سنائی دیتی تھی تو سرور اور نشاط سے میرا سر گھوم جاتا تھا — میری آنکھوں میں خوشیاں ناچنے لگتی تھیں۔ میرے ملنے والے کہتے کہ میں محض زندہ

رہنے پر ہی مطمئن اور خوش ہوں مگر اب وہ یہ نہیں کہہ سکتے کیونکہ یہاں دریچے میں کھڑی میں اپنے آپ کو زیادہ معمّر اور تجربہ کار محسوس کر رہی ہوں۔

مجھے یقین ہے وہ ریسٹوران میں میرا انتظار کر رہا ہوگا۔۔۔۔ لیکن اس کی بے اعتنائی میں زیادہ عرصہ برداشت نہیں کر سکتی، اسے آج مجھے مخاطب کرنا ہی ہوگا۔ یہ امید اور ناامیدی کی زندگی تو ہر روز کی موت ہے۔۔۔۔۔ میں ریسٹوران میں جانا نہیں چاہتی۔۔۔۔۔ میں تو صرف اسے دیکھنے وہاں جاتی ہوں۔۔۔۔۔ کاش وہ کہیں اور ملے۔۔ کسی پارک میں یا کسی کیفے میں جہاں لوگوں کا ہجوم نہ ہو، جہاں میں اطمینان سے گفت گو کے سحر سے متاثر ہو جاؤں کیوں کہ باتیں تو زبان کی بجائے آنکھوں سے بھی ہوا کرتی ہیں۔

(گھڑی پانچ گھنٹے بجاتی ہے)

اوہ! میں گھنٹے بھر سے بیکار بیٹھی ہوں۔ اداس ہوں مجھے اپنے میلے کپڑوں اور الجھے بالوں سے گھن آ رہی ہے۔ مجھے تو آج اپنے آپ کو زیادہ دل کش بنانا چاہیے اور سیما آ رہی ہوگی مجھے جلدی کرنی چاہیے۔

(موسیقی)

آج میں بہت خوش ہوں۔ وہ میرے دل کی دھڑکنوں کے قریب تر محسوس ہو رہا ہے۔ اب ہم زیادہ دیر تک خاموش نہیں رہ سکتے۔ اُف! خوشی سے میرے آنسو جیسے گلے میں پھنس گئے ہیں۔۔۔۔۔ یقیناً اس کی بھی یہی حالت ہوگی۔

(بارش کا شور)

ہائے بارش کتنی اچھی چیز ہے۔ خنک موسم کتنا بے کیف ہوتا ہے۔

ابھی میں تیز تیز چلتی ہوئی ریسٹوران جاؤں گی۔ میرے بالوں میں اٹکے ہوئے بارش کے قطرے موتیوں کی طرح چمکیں گے اور میرا جسم بارش کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا سے یخ ہو گا جیسے برف میں لگا ہوا کوئی پھل۔

(دروازہ کھلنے کی آواز)

سہیلی : تیار ہو گئیں! اوہو آج تو نگاہ نہیں ٹھہرتی بھئی بچارے کو قتل کرنے کی ہی ٹھان لی ہے۔

میں : دیکھیں کون قتل ہوتا ہے۔

سہیلی : تو آؤ پھر چلیں۔

(پرندوں کا شور)

میں : ہم تیز تیز چل رہے ہیں۔ بارش اب پھوار میں تبدیل ہو گئی ہے۔ سیما متواتر بولے جا رہی ہے.... میں اس کی باتیں بہت کم سن رہی ہوں۔ .... ہائے ہمیں دیر ہو گئی ہے۔ کہیں وہ جا نہ چکا ہو، یا شاید ابھی آیا ہی نہ ہو.... اسی ایک میز پر بیٹھا آنکھوں ہی آنکھوں میں میرا استقبال کرتا ہے۔ جونہی میں دروازے میں داخل ہوتی ہوں وہ مجھ پر ایسی نظریں گاڑ دیتا ہے جو میرا جائزہ لیتی محسوس نہیں ہوتیں مگر پھر بھی مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے کہہ رہا ہو — آہا! تم آگئیں۔

(راستے کا شور)

سیما کی نہ ختم ہونے والی باتوں پر مجھے غصہ آ رہا ہے۔ وہ بولے جا رہی ہے۔ دفتر کی باتیں، موسم کی باتیں، کھانے کی، پہننے کی — میں چپ چاپ اس کے ہمراہ چل رہی ہوں۔ میں سوچتی ہوں میری خاموشی کو محسوس کر کے سیما خود ہی خاموش ہو جائے گی لیکن وہ متواتر بولے جا رہی ہے۔ میں اس

کے بولنے سے اس قدر اکتا گئی ہوں کہ اسے "بکومت" کہنے کے لیے کئی بار میرے ہونٹ پھڑپھڑائے ہیں۔ اس کے سر کے مصنوعی پھول کو پاؤں تلے مسل ڈالنے پر کس قدر جی کچکچایا ہے لیکن میں اپنا مزاج خراب نہیں کرنا چاہتی۔ میں خاموش چل رہی ہوں۔

اب ہم ریسٹوران کے قریب پہنچ گئے ہیں۔ اُف میرا دل زور زور سے دھڑک رہا ہے، میں آہستہ آہستہ چلنے لگی ہوں۔ مجھ پر کپکپی طاری ہو گئی ہے۔

سیما نے ریسٹوران کا دروازہ کھولا ۔ سگرٹوں کا دھواں ۔ موسیقی کی لہریں لیے ہمارا استقبال کرنے کو بڑھا ہے۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا ہے۔ میں جی کڑا کر کے آنکھیں کھولتی ہوں۔

(موسیقی)

شکر ہے وہ اپنی میز پر موجود ہے.... وہ اس بے ہنگم شور اور ہجوم سے کتنا بے نیاز اور دور نظر آتا ہے۔

(کسی میز پر دو تین آدمی اونچا بولنے لگے ہیں
جیسے لڑائی ہو گئی ہو)

اوہ ۔ اگر اس وقت کوئی مجھے تنگ کرنے یا ستانے کی کوشش کرے تو وہ ضرور میری مدد کو کود پڑے گا، میں چاہتی ہوں وہ میری حفاظت کرے.... مجھے اس کی ذات پر اعتماد ہو چکا... ہا ہا ہا یہ کتنی عجیب بات ہے کہ میں اس کے متعلق کچھ نہیں جانتی پھر بھی ایسی باتیں سوچنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتی ہوں۔

(لڑائی آہستہ آہستہ کم ہو جائے۔ موسیقی ابھرے)

میں ریسٹوران میں آنا نہیں چاہتی تھی لیکن یقیناً کوئی طاقت ہے جو مجھے یوں کھینچ رہی ہے..... میں پاگل تو نہیں ہو گئی ہوں (سیما کو دور سے کوئی آواز دیتا ہے) اِدھر سیما اِدھر! میں بے وقوفوں کی طرح کھڑی ہوں، سیما کو ایک ہی میز پر دو نشستیں مل گئی ہیں۔ سیما کے دوست جو میرے بھی واقف ہیں ہمیں بُلا رہے ہیں۔ اِدھر آجاؤ.....

ریسٹوران کھچا کھچ بھرا ہوا ہے۔ میں سیما کے ساتھ میزوں کے درمیان سے گذر رہی ہوں۔ کئی بار میزوں سے یا لوگوں کی کہنیوں سے ٹکرائی ہوں اس لیے مجھے بار بار معاف کیجیے.... کہنا پڑا ہے۔ شکر ہے ہم اپنی جگہ پہنچ گئے ہیں۔ اب میں کوشش کر کے نظریں اٹھا رہی ہوں.... اوہ

(موسیقی)

وہ ہمارے ساتھ والی میز پر بیٹھا ہے، یا ہماری میز اس کے ساتھ ہے اُف! میرا چہرہ سرخ ہو گیا ہے، اس سردی میں میرا ماتھا پسینے کے قطروں سے بھر گیا ہے، میری سانس تیز ہو گئی ہے۔ سیما یہ سب محسوس کر چکی ہے اور مجھے آنکھوں ہی آنکھوں میں سمجھا رہی ہے۔

اُف! اب اس نے کافی کی پیالی دیتے وقت میری انگلی پر چٹکی لی ہے، میں زمین میں دھنسی جا رہی ہوں۔ میرا جی چاہتا ہے یہاں سے اُڑ جاؤں کہ کوئی جاتے بھی نہ دیکھ سکے۔ میری ہمت نہیں پڑتی کہ اسے جی بھر کر دیکھ بھی لوں۔

(رقص کی دُھن)

بہت سے جوڑے ناچنے کو اٹھے ہیں۔ سیما بھی جا رہی ہے مگر میں نے جانے سے انکار کر دیا ہے۔ اوہ! میں تو اکیلی اپنی میز پر رہ گئی ہوں اور

وہ ..... ہیں، اور، وہ! بالکل نزدیک بیٹھے ہیں.... اب مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے یہ نشست مَیں نے ارادتاً منتخب کی ہو لیکن مَیں نے دانستہ تو کچھ بھی نہیں کیا، تو کیا قدرت ہمارا ساتھ دے رہی ہے؟ ہاں! ضرور، قدرت نے اسے میرے لیے منتخب کیا ہوگا، شاید وہ مجھے انہی خوب صورت نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ نہیں، وہ تو بالکل ایک مجسمے کی طرح اپنی سیدھ میں جا رہا ہے۔ ابھی وہ میری طرف دیکھے گا! تو کوئی نئی بات تو نہیں ہوگی۔ مگر ہم بُت کیوں بنے بیٹھے ہیں۔

اوہ بیٹھے بیٹھے مَیں اب اتنی بیزار ہوگئی ہوں کہ میرے جی میں آتا ہے کہ اگر وہ یہاں سے اٹھ جائے تو اچھا ہے.... ہائے وہ جلدی سے مجھ سے بات کیوں نہیں کرتا۔ وہ مجھ سے بولے تو مجھے معلوم ہو سکے کہ جو میری حالت ہے وہ محسوس کرتا ہے یا نہیں۔ مگر میری پاگلوں سی باتیں..... ہائے مَیں شرمندہ ہو رہی ہوں۔

(رقص کی دُھن شروع ہوتی ہے اور آہستہ آہستہ
فیڈ آؤٹ ہو جاتی ہے)

رقص کا دَور ختم ہو گیا ہے۔

سیما اور اس کے ساتھی واپس میزوں پر آتے ہوئے خدمت گاروں سے کچھ کھانے کو منگوا رہے ہیں۔ سیما زور زور سے ہنستی ہے لیکن مَیں ظاہر کرتی ہوں کہ میرا اور اس کا کوئی تعلق نہیں۔ مگر میرا یہ خیال کس قدر احمقانہ ہے کیوں کہ وہ تو اچھی طرح جانتا ہے کہ مَیں ان کے ساتھ ہی بیٹھی ہوں۔

(دُور سے نزدیک آتے ہوئے چند لڑکوں اور
سیما کی آواز)

اوہ یہ دو لڑکے اور ان کے ننھے آگئے، یہاں تو جگہ نہیں ہے !

(آواز : کرسیاں ساتھ ساتھ جوڑلو، سب
بیٹھ جائیں گے)

چار کے بیٹھنے کی جگہ پر اب ہم چھ بیٹھے ہیں، ایک دوسرے کے ساتھ جُڑے جا رہے ہیں، میں اُس کی طرف سرک گئی ہوں، میں اور زیادہ کھسک رہی ہوں !

(موسیقی)

اُف ! میں نے اس کے کوٹ کو چھو لیا ہے۔ میرے تمام جسم میں بجلی کی لہر دوڑ گئی ہے، اب میں اُس کی طرف گھوم گئی ہوں، آہ ! پہلی بار اُسے جی بھر کر دیکھا ہے۔

میں : معاف کیجیے گا !

شاید اس نے محسوس ہی نہیں کیا - وہ تو حیران ہے کہ میں اُس سے کیوں معافی مانگ رہی ہوں۔ میں یقیناً پگلی نظر آتی ہوں۔ وہ تو مسکراتا ہوا مجھے دیکھ رہا ہے۔

اچھا میں پھر کہتی ہوں :

میں : معاف کیجیے گا !

وہ : کوئی بات نہیں !

اُف اس کی آواز، کتنی پیاری ہے - مردانہ آوازیں زیادہ پُرکشش نہیں ہوتیں لیکن اس کی آواز میں ایک خاص جاذبیت ہے مجھے اس کی ہر چیز پیاری معلوم ہوتی ہے۔ کتنے پیار سے کہا ہے :

"کوئی بات نہیں !"

لیکن ۔ کیا وہ صرف یہی کہنے پر اکتفا کرے گا ؟ وہ بات یہاں پر ختم کر دے گا ؟ مَیں ہی بات شروع کروں :

مَیں : (کھنکار کر) آج بہت زیادہ گرمی ہے ۔ نہیں ، نہیں سردی ۔

وُہ : بہت زیادہ ۔

مَیں : کیا ؟

وُہ : سردی ۔ سردی

مَیں : وہ مسکرا رہا ہے ۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ میرا مذاق اڑا رہا ہو ، مگر ایک انوکھے جھجکے مجھے دیکھ رہا ہے جیسے وہ چاہتا ہے کہ مَیں یوں ہی پاگلوں کی طرح بوکھلائی ہوئی بولتی رہوں ۔ ۔ ۔ اف مَیں بہت زیادہ جذباتی ہوئی جا رہی ہوں لیکن وہ میری کوئی مدد نہیں کرتا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مَیں بڑی مشکل سے سنبھلتی ہوں ۔

مَیں : ہا ! یہ آرکسٹرا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

وُہ : ہاں ! بُرا نہیں ہے ۔

مَیں : یہ الفاظ اس نے محض مجھے خوش کرنے کے لیے کہے ہیں ۔ مَیں اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہی ہوں نا ! یوں لگتا ہے جیسے مَیں نے کوئی بے موقع بات کی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اب پتہ نہیں آگے کیا کہوں ۔ وہ اسی طرح مجھے دیکھے جا رہا ہے ۔ لیکن کبھی کبھی یوں لگتا ہے جیسے وہ میرے متعلق سوچ نہیں رہا ۔ تو بھلا یہ کیا بات ہوئی ! اس بات سے مَیں جلنے لگی ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ ایک بڑا آدمی بھی ہو سکتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ہیں ۔ ۔ ۔ ہاں ! مَیں نے پہلے تو ایسے جذبات محسوس نہیں کیے ۔ ۔ ۔ ۔ بہرحال وہ جتنی دیر میرے متعلق سوچتا ہے ، خواہ کسی بھی پیرایہ میں کیوں نہ سوچے اس سے مجھے دل برداشتہ نہیں

ہونا چاہیے ..... اگر مَیں ہر وقت اس کے متعلق سوچتی ہوں تو یہ اس کا قصور ہے۔ اگر وہ مجھے پسند نہیں کرتا تو مجھے اس انداز سے بار بار دیکھنے کا اسے کوئی حق نہیں اور اگر وہ یوں ہی دیکھتا رہتا ہے، اپنی دلکش نظروں سے، تو میرا یہ یقین ٹھیک ہے کہ وہ مجھ سے پیار کرتا ہے ..... پیار ...... مجھ سے ...... وہ .....

مَیں نے آج تک کبھی کوئی لڑکا اتنا خاموش اور شرمیلا نہیں دیکھا۔ ویسے وہ لڑکا بھی نہیں ہے باقاعدہ مرد ہے۔ اس کی عمر تیس سال کے لگ بھگ ہوگی۔

(برتنوں کا کھڑکا۔ کافی پینے کی آواز)

مَیں نے کافی کا آدھا پیالہ حلق میں انڈیل لیا ہے۔ پتہ نہیں میرا یہ بوکھلانا کب دُور ہوگا۔ چینی والا چمچہ پیالی میں اور پیالی والا چینی میں، ابھی مَیں نے قمیض پہ دودھ گرا لیا ہے۔

سہیلی : (دُور سے) بھئی آؤ نا! کیا بیٹھی منہ لسور رہی ہو۔

(دو لڑکوں اور سیما کی ہنسی)

مَیں : مجھے اس کی پرواہ نہیں۔ ہنس رہے ہیں ... ہی ہی ہی ہی ... مَیں بھی تو کبھی ہنسوں گی۔

مَیں : (کھنکار کر) آپ رقص نہیں کرتے؟

وُہ : (ذرا سختی سے) مجھے پسند نہیں!

مَیں : اس کا لہجہ سخت ہوگیا ہے۔ مجھے جواب دے کر اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا ہے ..... پھر ایک مسلسل خاموشی طاری ہوگئی ہے، یوں جیسے ہم کوسوں دور بیٹھے ہیں ..... ہائے اس کا خیال میری جان نہیں چھوڑتا

.... اوہ اب مَیں سمجھی کہ وہ یہاں کیوں آتا ہے۔ اس ریسٹوران سے اس کی یادیں وابستہ ہوں گی ..... اُف مجھے یقین ہو چلا ہے کہ مَیں اس کی کسی واقف لڑکی سے مشابہ ہوں گی، اسی لیے وہ ہر وقت میری طرف یوں دعوتی نظروں سے دیکھتا رہتا ہے .... اوہ مَیں اس خیال سے کرسی میں دھنسی جا رہی ہوں ..... مَیں .... ایک بے بس انسان ہوں .... ہاں! مَیں صرف یہی تو ہوں! — کوئی امید نہیں رہی .... مَیں ابھی کیا سوچ رہی تھی .... کیسے کیسے خواب مَیں نے دیکھے تھے .... جھرنوں کا سنگیت مَیں نے سنا تھا .... کس کے لیے؟ .... ایسے مرد کے لیے؟ ..... اُف! کتنا دل شکن واقعہ ہے .... مَیں بیمار لگنے لگی ہوں .... مَیں کانپ رہی ہوں

(ہلکی سی چیخ)

اس نے اپنا ہاتھ میرے بازو پر رکھ دیا ہے۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ اگر وہ جلدی سے اپنا ہاتھ اٹھا نہ لے گا تو مَیں یکدم چیخنا شروع کر دوں گی .... ہوں ہوں ....

وُہ : میرے ساتھ قہوہ پیو گی؟

مَیں : مَیں نے اثبات میں سر ہلا دیا ہے!

ہائے مَیں اپنے ہونٹ کاٹنے لگی ہوں۔ میرا حلق سوکھ رہا ہے۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے بیرے کو بلا لیا ہے ..... اور .... اصلی کشمیری قہوہ لانے کو کہا ہے۔

(برتنوں کے رکھنے کا شور)

لو! وہ لے بھی آیا۔

(پیالیوں میں ڈالنے کی آواز)

اس نے دو پیالیوں میں قہوہ انڈیل لیا ہے — ہا ! اب اس نے مجھے پیالی اٹھانے کو کہا ہے ۔

مَیں : تمھارا جامِ صحت . . . .

وُہ : تمھاری مسرت میری گڑیا !

مَیں : اوہ کتنا اپنا ہے ۔ میں قہوہ پی رہی ہوں ۔ سیما نے میری طرف ایسا اشارہ کیا ہے جس سے مجھے یوں لگا ہے کہ جیسے کہہ رہی ہو : کہو اب تو خوش ہو !

(لوگوں کے ناچنے اور شور و غل کی آواز ، گھڑی
بارہ بجاتی ہے — لوگوں کے جانے کا شور ،
آرکسٹرا مدھم پڑ جاتا ہے ۔)

(موسیقی)

رسٹیوران سے لوگ جا رہے ہیں ۔

سیما تھکی تھکی لگتی ہے ۔ مجھے اشاروں سے کہہ رہی ہے : چلو اُٹھو ! لیکن میں نے اس کے ساتھ گھر واپس جانے سے انکار کر دیا ہے ۔ وہ منہ بنا کر اپنا ہاتھ بڑھا رہی ہے : اچھا صبح ملاقات ہوگی . . . . وہ اداس ہو کر جا رہی ہے . . . . کوئی بات نہیں ، اس کے لیے تو زندگی بڑی طویل ہے لیکن مَیں شاید دو ایک منٹ اور زندہ ہوں ۔ مجھے میرے دل کی آواز سنائی دیتی ہے مگر مَیں تو خاموش بیٹھی ہوں ۔ شاید یہ اس کی آواز ہے . . . . وہ میرے دل میں ؟ . . . . عجیب احساس ہے . . . . .

آج رسٹیوران کی شمعیں وقت سے پہلے مدھم ہو گئی ہیں جس طرح بارش میں گلی کی بتیاں . . . .

مَیں نے اور اس نے قہوہ ختم کر لیا ہے ۔

میں نے اپنا بیگ کھولا ہے اور آئینہ دیکھنے لگی ہوں۔ اُف میری آنکھیں یوں چمک رہی ہیں جیسے اندھا تالاب روشنی سے چمک اٹھتا ہے۔ میری بھنویں پھڑک رہی ہیں۔ میرا منہ بھیگا ہوا ہے۔ اب مجھ میں ایک حوصلہ پیدا ہو رہا ہے۔ ایک جرأت..... میں اپنے دونوں ہاتھ میز پر رکھتی ہوں اور ٹکٹکی باندھ کر اس کی طرف دیکھنے لگی ہوں..... ہا، اس کی ایک نظر میں آغوش کی سی مدہوشی ہے......

تقریباً سب لوگ جا چکے ہیں۔ اور بیروں نے بھاری پردے دروازوں اور کھڑکیوں پہ کھینچ دیے ہیں۔

میں اس کے ساتھ بات کرنا چاہتی ہوں۔

آج میں اپنا دل کھول کر اس کے سامنے رکھ دوں گی اور اسے بتاؤں گی کہ کیسے کیسے وسوسے اور شبہات مجھے تنگ کرتے ہیں مگر وہ مجھے یوں کیوں دیکھ رہا ہے جیسے میں کوئی کھوئی ہوئی روح ہوں!...... وہ کچھ مغموم اور اداس نظر آنے لگا ہے..... کیوں..... وہ آخر بولتا کیوں نہیں.......

میں نے کہا: وہ......

وہ : تمھیں اب گھر چلے جانا چاہیے۔

میں : مجھے.....

وہ : معاف کرنا۔ میں تمھارے ساتھ جا نہ سکوں گا۔ مجھے یہاں کچھ دیر اور ٹھہرنا ہے!

میں : یہاں! اور ٹھہرنا ہے؟

وہ : میں یہاں کسی سے کہہ دیتا ہوں، تمھیں چھوڑ آئے گا۔

(روتی ہے)

مَیں : میری آنکھوں سے خود بخود تیزی سے آنسو بہنے لگے ہیں۔ مَیں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا ہے۔

وُہ : تم رو رہی ہو !

مَیں : نہیں — یہ نہیں ہو سکتا — تم مجھ سے ایسا سلوک نہیں کر سکتے.... اب مجھے کوئی طاقت تم سے جدا نہیں کر سکتی......

(رونا)

.... تم میرے خوابوں میں بستے ہو۔ مَیں نے تم سے محبت کرنا سیکھا ہے۔ تم میری زندگی ہو۔ تم دن رات میرے دل کی گہرائیوں میں رہتے ہو، اور تمھیں یہ سب کچھ معلوم بھی ہے......

وُہ : مَیں نے صرف اتنا کہا ہے کہ مجھے یہاں اور ٹھہرنا ہے۔

مَیں : میرے بغیر ؟ تم ..... اوہ ..... اگر تم نے ایک بار بھی مجھے حقارت سے دیکھا ہوتا تو آج میری یہ حالت نہ ہوتی۔ یہ بات آغاز میں ہی ختم ہو جاتی......

بتاؤ ! مجھے دیکھ کر تمھیں کسی اور عورت، تمھاری کسی محبوبہ کی یاد آتی ہے نا ؟..... چلو، مجھے منظور ہے۔

مجھے اس کی بھی پرواہ نہیں کہ تم اس سے اب بھی پیار کرتے ہو، لیکن یوں خاموش نہ رہو۔

مَیں نے اس کے سوا کبھی کچھ نہیں سوچا۔ کبھی کچھ نہیں چاہا۔

مَیں تمھیں ہر جگہ پاتی ہوں۔ کبھی کبھی تو بازار میں اُن آدمیوں کے پیچھے والہانہ دوڑ پڑتی ہوں جن کی ذرا سی مشابہت تم سے ہوتی ہے۔ جب مَیں گھر

میں ہوتی ہوں تو تم سے بلند آواز میں باتیں کرتی ہوں۔ کپڑے پہنتے وقت میں نے تمھاری پسند اور ناپسند کو مقدّم سمجھا ہے۔ مَیں نے اپنے بالوں کے انداز کو بھی بدل لیا ہے تم نے محسوس نہیں کیا کہ مَیں تمھاری پسند کو جان گئی ہوں ؟

ایک نادان لڑکی محبت کر کے اتنا سلجھ گئی ہے تم محسوس نہیں کرتے ؟

معلوم نہیں تم نے مجھے کیا کر دیا ہے۔ مجھے اپنے ساتھ کام کرنے والے اچھے نہیں لگتے۔ لڑکیاں مجھے بُری لگنے لگی ہیں۔

جوان لڑکوں کو دُور سے دیکھ کر ہی مَیں بیزار ہو جاتی ہوں۔ مَیں ہر جگہ اجنبی سی ہو گئی ہوں۔

مَیں تو ہر وقت تمھارے ساتھ رہتی ہوں جیسے یہ حقیقت ہو۔ تم نے مجھ سے میری پہلی زندگی چھین لی ہے اور نئی زندگی دینے سے گریز کر رہے ہو ؟

مَیں کیا کروں۔ میرے پاس باقی ہے ہی کیا۔

(آرکسٹرا دھیمے سُروں میں بجتا ہے)

اس نے اپنا سر اوپر اٹھایا۔

اب میرا ہاتھ اس نے تھام لیا۔ میرا دل رُک رہا ہے۔

وہ کچھ کہنے . . . .

مَیں اَور پریشان نہیں ہو سکتی۔ خدایا مجھے صبر دے۔ مَیں سب کچھ برداشت کر لوں گی لیکن مَیں اسے چھوڑ نہیں سکوں گی۔ مَیں تو اس کی آنکھوں میں جھلک رہی ہوں۔ مَیں منتظر ہوں کہ وہ کچھ بولے۔

لیکن ــــ وہ پریشان کیوں ہے ؟

(ساز رکھنے کی آوازیں۔ ساتھ والے ہوٹل سے موسیقی کی آواز)

آرکسٹرا خاموش ہو گیا ہے۔ ساز ندے ساز سنبھال رہے ہیں۔ پیانو بند ہوا۔ بیرے کرسیاں میزوں کے نیچے دھکیل رہے ہیں۔ ملحقہ کیفے سے ہلکا ہلکا شور سنائی دے رہا ہے۔ چاروں طرف سناٹا چھا گیا ہے اور میں بے چینی کے عالم میں بیٹھی اس کے بولنے کی منتظر ہوں۔ اگر وہ میرا ہاتھ چھوڑ دے تو میں یقیناً دھڑام سے گر پڑوں۔ اس کا ہاتھ میری زندگی کا سہارا ہے۔

وہ چائے پینے لگا ہے۔ سردی بڑھ گئی ہے لیکن میں اور نہیں پیوں گی۔ میں پاگلوں کی طرح اپنے آپ سے باتیں کیے جا رہی ہوں۔ میرے حواس جواب دے چکے ہیں۔ میں تو جیسے فضا میں معلق ہوں۔ اوہ میں گرنے لگی ہوں۔ یہ احساس کتنا بھیانک ہے ..... مکمل خاموشی اور یہ جان لیوا انتظار ......

وہ ...... وہ بولنے لگا ......

وُہ : میرے گمان میں بھی یہ نہ تھا کہ بات یہاں تک آ پہنچے گی .... مجھے معاف کر دو .... لو یہ چائے میرے ساتھ پیو .... پھر اس کے بعد ہم ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں گے۔

مَیں : ...... کیا ؟

وُہ : بولو نہیں۔ غور سے سنو ! میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں پھر یہاں کبھی نہیں آؤں گا۔ میں تمھیں گھر تک چھوڑنے نہیں جا سکتا ...... کیوں ؟ .... یہ تم سمجھ نہ سکو گی ..... بس .... میں صرف اتنا ہی کہنا چاہتا ہوں ......

مَیں : اُف ! اس کا ہر لفظ میرے ذہن پہ یوں گرا ہے جیسے میرے

شعور کو چیرتا ہوا میری روح میں جذب ہو گیا ہو۔ میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی ہیں —اور— وہ میری آنکھوں میں بغیر پلک جھپکے عجیب انداز سے دیکھے جارہا ہے۔

اُف میرے اللہ! کیا بات ختم ہو رہی ہے! مگر یہ تو معلوم ہو کہ کیوں — تاکہ میں اسی سوچ میں جان نہ دے بیٹھوں۔

اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔ ان میں محبّت بھی ہے اور بددلی بھی ...... اوہ ...... (روتی ہے) کہو یہ سب کیوں .... کیوں ....

وُہ : تو تم واقعی جاننا چاہتی ہو؟

مَیں : ہوں

وہ دفعتاً مختلف معلوم ہونے لگا ہے۔ اس کے چہرے پر مایوسی کے آثار ہیں ....

مَیں : خدارا بولو۔ تم کیا کہہ رہے ہو؟ مَیں .....

وُہ : تو گویا ..... کیا یہ تمھارا آخری فیصلہ ہے؟

مَیں : کیسا فیصلہ؟ مجھے تو صرف یہ معلوم ہے کہ تم میرے ہو۔

وُہ : تم واقعی میرے اتنے قریب ہو گئی ہو؟

مَیں : اُف تم صبر آزما ہو۔

وُہ : تم مجھ سے پیار کرتی ہو نا؟

مَیں : ہاں (خواب میں)

وُہ : تو پھر آؤ چلیں۔

(اس کے اٹھنے سے کھڑکا ہوتا ہے)

مَیں : (چیخ) الٰہی ..... میری روح خالی ہو گئی ہے .... یا خدا!

میرا ماضی، میرا حال اور...... وہ میرا ہاتھ پکڑے کھڑا ہے......
بغیر ٹانگوں کے — وہ خوب صورت سینہ اور شانوں کے باوجود میرے کولھوں تک مشکل سے پہنچ رہا ہے...... وہ ایسا مجسمہ ہے جس کی ٹانگیں ٹوٹ گئی ہوں اور ان کی جگہ چھوٹی چھوٹی مصنوعی ٹانگیں گھٹنے کو لگا دی ہوں......

وہ میرے ساتھ لگا کھڑا ہے۔
نامکمل مرد کی مکمل یاد......

٭

خون اور مہک

(ڈرامہ)

کردار

سلیم	:	ایک سنجیدہ نوجوان
سعید	:	سلیم کا دوست (ایک خوش باش نوجوان)
شمّی	:	ایک پہاڑی لڑکی
ناجو	:	شمّی کی بہن
بابا	:	شمّی اور ناجو کا باپ

وائلن پر شام کا راگ

پرندوں کے چہچہانے کی آواز

دور سے قریب آتے ہوئے قدموں کی آواز

سلیم : کتنی خوب صورت جگہ ہے ، ہر طرف بنفشے کے پھول کھلے ہیں جن سے شام اور بھی کجلائی جا رہی ہے ۔

شمّی : بابو پھول خریدو گے ؟

ناجو : ابھی ابھی توڑے ہیں ہم نے ۔

شمّی : بابو یہ لو !

سلیم : پھول ، مگر ہمیں تو بھوک لگ رہی ہے ۔

سعید : تم بتا سکتی ہو یہاں سے ڈاک بنگلہ کتنی دور ہے ؟

شمّی : ڈاک کیا بابو ؟

سلیم : ڈاک بنگلہ - جہاں لوگ ٹھہرتے ہیں ۔

ناجو : اری شمّی ! یہ پڑاؤ کو پوچھ رہے ہیں شاید !

سعید : تو تمھارا نام شمّی ہے -

سلیم : شمّی - کتنا اچھا نام ہے ۔

شمّی : ہاں میرا نام شمّی ہے اور اس کا نام ناجو

سلیم : اچھا تو پڑاؤ یہاں سے کتنی دور ہے ؟

شمّی : قریب ہی۔ یہ رہا۔
سلیم : یہ۔ یہ کہاں ؟
شمّی : آؤ ہم بتائیں۔
سعید : ہمیں تو دو گھنٹے ہو گئے ڈھونڈتے ہوئے۔
شمّی : تم اوپر والی پگڈنڈی بھول گئے ہو بابو۔ اسی چوراہے پر سے آرہے ہو نا؟
سلیم : ہاں !
ناجو : جبھی۔ اور تمھارا سامان کہاں ہے ؟
سعید : وہ مزدور پہلے ہی لے گئے تھے۔ ہم لوگ پھرتے پھراتے ہوئے آرہے ہیں۔
سلیم : اور پہاڑی پگڈنڈیوں کے بیچ و خم میں الجھ کے رہ گئے۔
شمّی : گھبراؤ نہیں بابو ! لو وہ دیکھو تمھارا پڑاؤ۔
سلیم : ارے واقعی۔ ہم تو بھٹکتے ہی رہے۔ شکر ہے کہ تم مل گئیں۔
ناجو : تو بابو آپ پھول خریدو گے نا ؟
سعید : ہاں ہاں۔ ضرور خریدیں گے۔ ذرا پہنچنے تو دو۔
سلیم : تم پھول بیچتی ہو ؟
شمّی : ہاں بابو۔ اس موسم میں پھول بیچتے ہیں۔
سلیم : اور پھر ؟
شمّی : پھر سردی شروع ہو جاتی ہے اور ہم انتظار کرتے ہیں۔
سعید : انتظار کس کا ؟
شمّی : اسی موسم کا۔

ناجو : اور تم ایسے بابوؤں کا۔

سلیم : وہ دیکھو مزدور ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔

سعید : شکر ہے رات ہونے سے پہلے پہنچ گئے ہم۔

سلیم : کھانے دانے کا انتظام کرو بھئی۔ مجھے تو بہت بھوک لگ رہی ہے۔

سعید : ہاں تم سامان وغیرہ کھولو۔ میں ابھی آیا۔

شمّی : (دور سے) بابو پھول لے لونا۔ ہمیں واپس جانا ہے۔

ناجو : ہاں۔ اندھیرا ہوا جارہا ہے۔ ہمیں دیر ہو رہی ہے۔

سلیم : اوہ۔ ارے بھئی اندر آجاؤنا۔

شمّی : بابو سامان بعد میں کھولنا۔ پہلے ہمیں . . . . .

سلیم : (نزدیک آتے ہوئے) اچھا بولو۔ کیا لوگی ان پھولوں کا ؟

ناجو : یہ سب لے لوگے ؟

سلیم : سب نہیں تو کیا آدھے۔ سب ہی خرید لیں گے۔

شمّی : بابو پانچ روپیہ ہوں گے ان کے تو۔

سلیم : صرف پانچ !

ناجو : (ہنس کر) چوّنی اور بڑھا دو۔

(دونوں ہنستی ہیں)

سلیم : اچھا تو لو۔ یہ پانچ روپے۔ اور یہ ایک چوّنی۔ رکھ دو پھول۔

شمّی : اے بابو۔ تم نے تو سچ مچ ہی . . . . .

سلیم : ہاں۔ تمھارا نام شمّی ہے نا ؟

شمّی : جی بابو۔

سلیم : کل بھی پھول لاؤگی نا تم۔

ناجو : ہاں ہاں بابو ! ہم روز لایا کریں گے ۔

شمّی : لو تمھارا کھانا بھی آگیا ہے ۔ تم کھانا کھاؤ ہم چلتے ہیں ۔

(دونوں چلی جاتی ہیں)

سعید : (کھاتے ہوئے) ارے یہ اتنے سارے پھول ۔ کیا سب خرید لیے ؟

سلیم : ہاں سب ہی خرید لیے ۔

سعید : کتنے پیسے دیے ؟

سلیم : پانچ روپے ۔

سعید : پانچ روپے ! واہ رے میرے یار ۔ ان چھوکریوں کی باتوں میں نہ آنا ۔ صفایا کر دیں گی ۔

سلیم : غریب لوگ ہیں بے چارے ۔ تم نے سنا نہ تھا وہ کہہ رہی تھی کہ اسی موسم کا انتظار کرتے رہتے ہیں ۔

سعید : آخوہ ..... سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے ۔

سلیم : یہ بات نہیں سعید ۔ مجھے ان لوگوں کی غربت اور بھولی صورتوں پر ترس آتا ہے ۔

سعید : اچھا تو آپ غربا پروری کر رہے ہیں ۔ یہ بھولی بھالی صورت والے ...... اچھا ہٹاؤ ۔ چلو اب سونے کی تیاری کریں ۔ تھک گئے ہیں ۔ آج تو ۔ صبح شکار کا پروگرام ہے نا ۔

سلیم : ہاں ہاں ۔ ضرور ۔ یہاں آئے کس غرض سے ہیں ؟

(رات کا EFFECT اور TIMELAPS
ستار پر بھیروں ۔ دروازے پر دستک)

شمّی : بابو ! اے بابو ..... اٹھو نا ۔

ناجو : تو بیرا اتنا دن چڑھ آیا، ابھی تک سو رہے ہیں۔

شمّی : (دستک دیتے ہوئے) بابو.... اے بابو۔

سلیم : سعید۔سعید۔ اٹھو۔ واقعی ہم تو گھوڑے بیچ کر سوئے ہیں۔

سعید : (اٹھتے ہوئے) واللہ اِن پہاڑیوں نے حد کر دی ہے۔معلوم ہوتا ہے رات بھر نیند نہیں آئی انھیں۔

سلیم : ارے بھئی اچھا خاصا دن نکل آیا ہے۔ یہ کہو کہ ہم ہی بے ہوش پڑے تھے۔

سعید : (دروازہ کھول کر) تو آگئیں آپ اتنے سویرے پھول بیچنے۔

شمّی : نہیں۔پھول تو نہیں ..... دودھ۔

ناجو : دودھ لوگے بابو جی ؟

شمّی : ہماری گائے کا ہے۔

سلیم : تم دودھ بھی بیچتی ہو ؟

شمّی : ہاں بابو ! میں نے سوچا۔ شاید تمھیں ضرورت ہو۔

ناجو : تو دودھ چاہیے بابو ؟

سلیم : ہاں چاہیے۔ روز دے جایا کرو ہمیں۔

شمّی : بہت اچھا لیکن بابو ذرا سویرے اٹھنا ہوگا۔ (ہنستی ہے)

سلیم : تم بڑی اچھی ہو۔ کل تم نے ہمیں راستہ بتایا اور.....

سعید : دیکھو آج ہم مچھلی کے شکار کو جائیں گے۔ تم بتا سکتی ہو سب سے اچھی جگہ کون سی ہے ؟

شمّی : جی وہ سامنے ہمارا گھر ہے اس کے پیچھے ایک بڑی جھیل ہے۔

ناجو : نہیں بابو ! اِس طرف چلو۔ وہاں کشتی بھی ہے۔ پچھلے سال جو بابو آئے تھے وہ وہیں سے مچھلیاں پکڑا کرتے تھے۔

سلیم : تو تم ہمارے ساتھ چلو ! چلوگی ؟

شمّی : کیوں ری ناجو چلے گی ؟

ناجو : اور پھول ؟

سلیم : پھول چننے بہت ضروری ہیں ؟

ناجو : مگر گھر جاکر کیا کہیں گے ؟

سلیم : اوہ تم پھول چن کر بیچتی ہو، اور پھر گھر جاکر . . . . .

شمّی : ہاں بابو ! کل ہمارا بابا بہت خوش ہوا تھا۔

سلیم : تو آج بھی ہم تمھیں اتنے ہی پیسے دے دیں گے۔

سعید : ارے بھئی چلو نا۔ دیکھو میں نے سب سامان تیار کر لیا ہے۔

سلیم : شمّی چلو یہ بیگ تم اٹھالو۔

شمّی : یہ کیا ہے بابو ؟

سعید : اسے ستار کہتے ہیں۔

ناجو : اس کا کیا کروگے ؟

سلیم : اسے بجائیں گے۔

شمّی : ہی ہی تو مچھلی نہیں پکڑوگے ؟

سعید : سارا دن مچھلی ہی پکڑتے رہیں گے ؟

سلیم : ارے بھئی ناشتہ وغیرہ رکھ لیا ہے ؟

سعید : بے فکر رہو۔ خانساماں نے ایک بھنا ہوا مرغ رکھ دیا ہے۔ کچھ بٹیریں پہلے تھیں۔

سلیم : ہاں رمچھلی دہیں بھون لی جائے گی۔

(بنسری)

(جاتے ہیں۔ پرندوں کے چہچہانے کی آواز۔
ساتھ ساتھ کوئی دلکش موسیقی کی آواز۔)

شمّی : آہا۔ یہاں تو کشتی بھی ہے۔

سلیم : کتنا حسین نظارہ ہے۔ یہ فلک بوس چوٹیاں۔ یہ رنگین وادیاں۔ جن کی گود پھولوں سے بھری ہے۔ بلند و بالا درخت قطار اندر قطار کھڑے کتنے خوب صورت لگتے ہیں اور ان پر بیلیں، پھولوں سے لدی ہوئی بیلیں کیسی نزاکت اور وارفتگی سے لپٹی ہوئی ہیں۔

سعید : اب جناب شاعری ہی فرماتے رہیں گے یا مچھلی بھی پکڑیں گے۔ یہ لو کانٹا۔

ناجو : بابو اِدھر ڈالو کنڈی۔ دیکھو یہاں مہاشیر ہے۔

سلیم : نہیں بھئی تم مچھلیاں پکڑو۔ میں ذرا وہاں گھاس پر بیٹھ کر اس ماحول میں کھو جانا چاہتا ہوں۔

سعید : (طنزیہ) تو یہ ستار بھی لیتے جائیے جب شاعری سے فرصت ملے تو اس سے دل بہلائیے گا۔

(سب ہنستے ہیں)

ناجو : کنڈی یہاں ڈالو۔

شمّی : نہیں نہیں وہ دور نکل گئی ہے۔ اِس طرف دیکھو یہاں ہے۔

ناجو : کھینچ لو۔ کھینچ لو۔

شمّی : اے ہے۔ کم بخت نکل گئی۔

سعید : ارے جاؤ کبھی مچھلی پکڑی بھی ہے تم نے۔ میں پکڑ کر دکھاتا ہوں۔

شمّی : ناجو۔ ناجو۔ جلدی آ۔ پھنس گئی مچھلی۔ بہت بڑی ہے۔

ناجو : (کھینچتے ہوئے) ارے سچ مچ بہت بڑی ہے۔ کھینچو۔ کھینچو۔

سعید : کیا سچ مچ ؟

شمّی : لو یہ دیکھو کہاں بابو !

سعید : واہ واہ بھئی غضب کر دیا تم نے تو۔ واقعی بہت بڑی مچھلی ہے۔ کم از کم پانچ سیر کی ہوگی۔

شمّی : اس سے بھی بڑی بڑی ہیں بابو یہاں۔

سعید : اسے وہاں سلیم کے پاس لے جاؤ اور بھوننے کا انتظام کرو۔ ہم اور پکڑتے ہیں۔

شمّی : دیکھو بابو میں نے یہ مچھلی پکڑی ہے۔

سلیم : کیا سچ مچ تم نے پکڑی ہے ؟ کمال کر دیا۔

شمّی : (ہنس کر) بابو نے کہا ہے تم اسے بھوننے کا انتظام کر لو۔ تم اسے صاف کرو۔ میں لکڑیاں چن کر لاتی ہوں۔

سلیم : لکڑیوں کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہم بغیر لکڑیوں کے ہی آگ جلائیں گے۔ دیکھو میں نے یہ سب چیزیں ترتیب سے رکھ دی ہیں۔ ذرا یہ دری پکڑنا۔ یوں۔ ہاں ٹھیک ہے۔ چلو ان کے آنے سے پہلے ہم کھانا تیار کر لیتے ہیں۔

شمّی : بابو ابھی تم نے کہا تھا بغیر لکڑیوں کے آگ جلا لوگے۔

سلیم : ہاں شمّی تم بیٹھ جاؤ اور دیکھو۔

شمّی : بابو یہ کیا ہے ؟

سلیم : یہی تو چولہا ہے۔ دیکھو میں ابھی جلا کر تمھیں دکھاتا ہوں۔

(STOVE کے جلنے کی آواز)

شمّی : ہائے بابو یہ تو جادو ہے۔

سلیم : شمّی اگر تم شہر میں جاکر دیکھو تو سچ مچ ہر چیز کو جادو سمجھو۔

شمّی : ہم غریب ہیں بابو۔ ہم شہر کیسے دیکھ سکتے ہیں۔ کیا ہوتا ہے شہر؟

سلیم : وہاں بہت کچھ ہوتا ہے شمّی — لیکن تمھارے کوہساروں کی وسعت میں حُسن ہی حُسن ہے۔

شمّی : شہر میں پھول ہوتے ہیں بابو۔

سلیم : ہاں شمّی بہت پھول ہوتے ہیں لیکن بناوٹی۔

شمّی : بناوٹی کیسے بابو؟

سلیم : ارے تم نہ سمجھ سکو گی۔ شمّی یہ روشن اور طلائی صبح۔ ہاہا۔ جیسے شب بھر میں بہار پھٹ پڑی ہے۔ شب بھر میں سنہرے پھولوں نے سارے سبزہ زار پہ قبضہ کر لیا ہے۔ سیب کے شگوفوں نے گلابی اور سفید چادر بچھا دی ہے۔ یہ سب کچھ تمھارا ہی حصہ ہے۔

شمّی : بابو تمھیں یہ جگہ بہت پسند ہے تو یہیں رہ جاؤ نا!

سلیم : ہاں شمّی۔ کاش میں ہمیشہ یہاں رہ سکوں؟

شمّی : تو رہ جاؤ نا!

سلیم : کیا کروں گا یہاں رہ کر؟

شمّی : سیر کیا کریں گے۔ میں تمھیں اس سے بھی خوب صورت جگہ پہ لے چلوں گی۔ یہاں ایک جھرنا ہے بابو بڑے زور سے پانی گرتا ہے۔ پھر ایک ندی سی بن جاتی ہے۔ اس پہ گلاب کے پھول تیرتے رہتے ہیں۔ جب اس پانی کو پئیں تو اس میں پھولوں کی مہک ہوتی ہے۔ میں اور نا جو بہت دفعہ وہاں جاتے ہیں —

ہائے بابو ان کی مہک تو بس ....

سلیم : تم کو گلاب کی خوشبو بہت پسند ہے ؟ اچھا یہ دیکھو ! یہ خوشبو کیسی ہے ؟

شمّی : یہ .... یہ تو رومال ہے تمھارا ۔

سلیم : ہاں ہاں ذرا سونگھو ۔

شمّی : (سونگھتے ہوئے) مہک ....

سلیم : کیسی ہے ؟

شمّی : تم تو سچ مچ جادو کرتے ہو بابو .... ہائے بابو .... ذرا دکھانا پھر ۔

(سونگھتی ہے)

سلیم : بہت پسند ہے ؟

شمّی : ہاں بابو ! یہ تو ان پھولوں سے بھی زیادہ تیز ہے ۔

سلیم : اگر تمھیں یہ پسند ہے تو میں تم کو ساری شیشی دے دوں گا ۔

شمّی : تو کیا یہ شیشی میں ہوتی ہے ؟ ہیں بابو .... ذرا ایک دفعہ پھر دکھانا (سونگھ کر) ہائے کتنی اچھی ہے ۔

سلیم : ارے بھئی پوری شیشی دے دوں گا ۔

شمّی : پوری شیشی کتنی بڑی ہوتی ہے ؟

سلیم : اتنی بڑی !

شمّی : اچھا وعدہ کرو بابو ضرور دینا ۔ میں اسے یہاں چھپا لوں گی ۔ یہاں ۔

سلیم : مہک چھپ نہ سکے گی شمّی ۔

سعید : (آتے ہوئے) واہ رے شاعر ادھر دیکھو ہم نے چار مچھلیاں اور

بگڑی ہیں۔ اب کہو کچھ کھلاتے ہو یا یونہی ....

سلیم : سب کچھ تیار ہے۔ ہم تمہارا انتظار ہی کر رہے تھے۔

سعید : بھئی ناجو نے ہم سے وعدہ کیا ہے کہ اگر ہم اسے ستار سنائیں تو یہ ہمیں گانا سنائے گی۔

ناجو : کب بابو۔ میں نے کہا تھا شمیؔ کو گانا آتا ہے۔

شمیؔ : جھوٹی۔ کب سنا ہے تو نے مجھے گاتے ہوئے؟

سلیم : پھر کیا ہوا شمیؔ جیسا آتا ہے ویسا ہی سنا دو۔

شمیؔ : نہیں بابو! تم یہ بجاؤ ہم ہی سنیں گے۔

سلیم : اچھا۔ لو یہ سنو!

(ستار پر ایک نغمہ بجاتا ہے)

سعید : بہت خوب۔ صنوبر کی شاخیں جھومنے لگی ہیں۔

شمیؔ : بابو تم تو بہت اچھا بجاتے ہو۔

ناجو : اچھا بابو اب ہم جاتے ہیں پھر کل صبح آئیں گے۔

سلیم : تم پھولوں کے پیسے لینا تو بھول ہی گئیں۔ یہ لو، اور یہ دو مچھلیاں بھی لیتی جاؤ۔

شمیؔ : بابو! اے .... وہ ..... یاد ہے نا؟

سلیم : ہاں ہاں۔ بھول کیسے سکتا ہوں شمیؔ!

شمی : بابو تم بڑے اچھے ہو۔

(چلی جاتی ہیں)

سعید : کیوں یار کیا بات ہے؟

سلیم : کچھ نہیں معصوم اور شبنمی آنکھیں۔

سعید : واقعی ہم بھی قائل ہو گئے۔ یہاں کا ذرّہ ذرّہ حسُن کا مرکز ہے۔
سلیم : اس کا انداز کس قدر دل کش تھا۔ بکھرے ہوئے سنہرے بال اور سُرمگیں آنکھیں۔ گویا نیم وا دو کلیاں۔ کتنی بھولی ہے۔ بے نیاز اور بے پرواہ۔
سعید : میں بھی حیران ہوں کہ مجھے کیوں حسُن کی چمک نے اس قدر جلد حیران کر دیا ہے۔ یہ سب شاید موسم بہار کا کرشمہ ہے۔
سلیم : جنگل کے کسی پھول کو اٹھا کر لبوں پر رکھ لینا اور اس کے لطیف مَس سے ان کا حالتِ کیف میں لرزنا۔ ہا۔ کیا عجیب نشہ ہے !
سعید : غروب کا وقت ہو رہا ہے۔ چلو چلیں۔
سلیم : ہاں چلو ! چٹانوں پر تاریکی اور خاموشی چھا جائے گی۔ ماہتاب پہاڑ کی چوٹیوں کی آڑ سے جھانکے گا۔ وہ سو رہی ہو گی۔ شاید میں بھی۔
سعید : چلو دوست ! تم تو سچ مچ شاعر بن گئے ہو۔

(TIME LAPS)

(سعید سیٹی بجاتا ہوا داخل ہوتا ہے۔ ساون ہنسائے بھادوں رلائے)

سعید : سلیم۔ سلیم ! اب اُٹھ بھی چکو۔ گھنٹہ بھر سے جگا رہا ہوں۔ تمھیں کیا ہو گیا ہے ؟ اتنی نیند !
سلیم : آ۔ ہاں۔ او ہوں۔ واقعی بہت دن چڑھ آیا ہے۔
سعید : میں ناشتہ کر چکا ہوں۔ اب تم اکیلے ہی کھانا۔ میں ذرا ڈاک خانے تک جا رہا ہوں۔
سلیم : کتنی دیر میں آؤ گے ؟
سعید : یہی کوئی دو گھنٹے میں۔

سلیم : ہاں وہ دودھ دینے آئی تھی ؟

سعید : ہاں آئی تھی۔ معلوم ہوتا ہے اسے ساری رات نیند نہیں آئی۔ منہ اندھیرے ہی دودھ لے کر آ پہنچی۔ اچھا اٹھو میں ابھی آیا۔

(ساون ہنسائے بھادوں رلائے)

سلیم : ساون بھادوں ہنسنا اور رونا۔ سچ کہا ہے کسی نے جہاں خوشی ہے وہاں غم بھی ہے۔

شمّی! کاش تُو میرے دل کی دھڑکنوں کو سن سکے اور میرے دل میں سلگتی ہوئی اس آگ کی گرمی کو محسوس کر سکے جو مجھے جلا ڈالنا چاہتی ہے۔ کاش! تُو مجھے سمجھ سکے۔ لیکن تُو کتنی بھولی ہے کچھ بھی تو نہیں سمجھ سکتی یا شاید کچھ سمجھنا ہی نہیں چاہتی۔

(ناشتہ کرنے بیٹھتا ہے۔ کچھ برتنوں کی آواز۔ دستک)

سلیم : کون ہے ؟

شمّی : میں ہوں بابو شمّی ـــ

سلیم : اندر آ جاؤ۔

شمّی : تم تو بہت سُست ہو بابو۔ دو دفعہ آئی ہوں۔ اب سو کر اُٹھے ہو۔

سلیم : ہاں۔ پتہ نہیں آج میں اتنی دیر تک کیوں سوتا رہا۔ یہاں آؤ شمّی! میرے قریب بیٹھ جاؤ۔

شمّی : بابو! وہ مہک دینے کا وعدہ کیا تھا نا تم نے ؟

سلیم : ہاں۔ ہاں۔ مجھے یاد ہے۔ میں پوری شیشی دے دوں گا تمھیں۔ شمّی! تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو۔ میں بھی تمھیں اچھا لگتا ہوں کیا ؟

شمّی : ہاں بابو تم بہت اچھے ہو۔

سلیم : شمّی کیا سچ مچ تم ..... تم کچھ نہیں سمجھتیں ؟

شمّی : کیا بابو ؟ یوں کیوں دیکھتے ہو مجھے ؟

سلیم : تمھاری ان شبنمی آنکھوں کو دیکھتا ہوں جن میں ایک ہلکی اور ٹھنڈی چمک پھیل رہی ہے۔ یہاں بیٹھ جاؤ شمّی ! یہاں۔

شمّی : بابو مجھے ڈر لگتا ہے۔

سلیم : کس سے ڈرتی ہو شمّی ؟ کیا مجھ سے ؟ بولو نا ..... کس چیز سے ؟ کیا مجھ سے ؟

شمّی : نہیں بابو ! بابا سے۔ میں کل شام کو بھی آئی تھی۔ تم سو رہے تھے۔ جب میں واپس چلی گئی تھی۔ پھر بابا نے بہت ڈانٹا۔ مارا بھی تھا۔ یہ دیکھو ! میرا بازو۔

سلیم : اوہ۔ تم کیوں آئی تھیں ؟ شمّی تمھیں بھی مجھ سے محبّت ہے ؟ کیا تم سمجھ گئی ہو ؟ بولو شمّی ! ہائیں آنسو ؟ یہ آنسو کیسے ہیں شمّی ؟

شمّی : اے ..... اے ..... تم نے کہا تھا ....

سلیم : کہو کچھ تو کہو۔ کیا تمھیں معلوم ہے پیار کیا ہوتا ہے ؟

شمّی : بابو ..... میں نے کہا ..... وہ ..... تم نے کہا تھا نا .....

سلیم : میری شمّی ..... لاؤ میں تمھارے بازو پر دوا لگا دوں۔ اوہ ..... یہاں کی ہر شے حسین لیکن دل کتنے پتھر ہیں ..... نور میں ڈھلا ہوا بازو ..... تمھارے بابا نے .....

ناجو : (دُور سے) شمّی ! شمّی ....

شمّی : (گھبرا کر) ناجو ! ..... یہاں ؟ ..... کیا ہے ..... بابا کہاں ہے ؟

ناجو : بابا بہت غصے ہو رہے تھے۔ مجھ سے پوچھا تھا کہ شمّی کہاں ہے ؟
شمّی : کیا کہا تو نے ؟
ناجو : میں نے کہہ دیا تھا کہ پھول چننے گئی ہے لیکن وہ کہتا تھا ہمیں پھول چننے کی ضرورت نہیں۔
شمّی : دوا رہنے دو بابو میں جاتی ہوں۔ کہیں بابا یہاں نہ آجائے۔
سلیم : اچھا شمّی جاؤ .... لیکن پھر کب ملوگی ؟
شمّی : جلدی ملنے کی کوشش کروں گی .... تم شیشی نکال رکھنا۔

(دونوں چلی جاتی ہیں۔ سلیم ستار پر کوئی غمگین دھن بجاتا ہے)

سعید : (آتے ہوئے) سلیم اٹھو۔ جلدی کرو۔
سلیم : کیوں کیا ہے ؟
سعید : چلو ذرا باہر نکلو، موسم کتنا دل کش ہے۔ سیر کریں گے ...... سیر کریں گے اور ساتھ شکار بھی۔
سلیم : لیکن میں سیر کو نہیں جاؤں گا۔
سعید : کیوں ؟
سلیم : کچھ نہیں ویسے ہی۔
سعید : ویسے ہی کیا۔ آخر کوئی وجہ بھی ہو۔
سلیم : بس یونہی۔ دل نہیں چاہتا۔ تم جاؤ۔
سعید : پھر وہی بات۔ آخر دل کیوں نہیں چاہتا۔
سلیم : یہ میں نہیں جانتا۔
سعید : تم بھی عجیب آدمی ہو۔ خیر کچھ بھی ہو۔ میں تمھیں ساتھ لے کر ہی

جاؤں گا۔

سلیم : اس ضد سے کیا فائدہ۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔

سعید : اگر اس مقام پر اور اس موسم میں بھی آپ کی طبیعت ٹھیک نہ رہے تو پھر خدا ہی حافظ ہے۔

سلیم : سعید تم جاؤ۔ میرا دل ان خوب صورت وادیوں میں اور بھی گھبرا جائے گا۔

سعید : نہیں سلیم میں تمھارے بغیر ہرگز نہ جاؤں گا۔ چلو اٹھو۔ اٹھو بھی۔

سلیم : اچھا دوست تم نہیں مانو گے .... چلو !

(دونوں گھوڑوں پر سوار ہو جاتے ہیں اور آپس میں باتیں کرتے جاتے ہیں۔ دور سے کسی چرواہے کی بنسری کی آواز۔)

سعید : سلیم دیکھو کتنا اچھا موسم ہے۔ بھلا یہ گھر میں بیٹھنے کا وقت تھا۔ اِدھر دیکھو۔

سلیم : ہاں۔ اور سنو کوئی بنسری بجا رہا ہے۔ کتنا درد ہے اس کے سُروں میں۔

سعید : تمھیں تو ہر بات میں درد ہی نظر آتا ہے۔ یہ سرد ہوائیں۔ یہ پھولوں سے لدی ہوئی وادیاں۔ خوب صورت چشمے ..... اور ..... اور .... یہ حسین چرواہے اور چرواہیاں ..... ایسے میں درد کا کیا ذکر۔

سلیم : حسین چرواہا نہیں .... معصوم اور بھولی .....

سعید : (طنزیہ) معصوم ..... مجھے تو تم ان سے زیادہ معصوم نظر آتے ہو۔ ان کی بھولی صورتوں پر نہ جانا۔

سلیم : نہیں سعید تم نہیں سمجھتے۔ ان کی مسکراہٹ میں ان کے دلوں کی کتنی

آہیں دم توڑتی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ معصوم دل غربت کے گھن سے کھوکھلے ہو چکے ہیں ۔ پیٹ بھرنے کے لیے رات دن انھیں اپنا خون پسینہ ایک کرنا پڑتا ہے ۔ وہ دیکھو سامنے ایک عورت لکڑیوں کا کتنا بوجھ اٹھائے چڑھائی چڑھ رہی ہے

سعید : چھوڑو ان باتوں کو کس سوچ میں پڑے ہو ۔ یہ بہت زندہ دل لوگ ہوتے ہیں ۔ یہ باتیں تو شاید ان کے ذہن میں کبھی نہ آئی ہوں ۔ اور ہاں وہ لڑکی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہی شبنمی آنکھوں والی ۔ ۔ ۔ ۔ کیا نام ہے اس کا ۔ ۔ ۔ ۔ ؟

سلیم : شمیؔ ۔

سعید : شمیؔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ معلوم ہوتا ہے آج ملاقات نہیں ہو سکی ۔

سلیم : نہیں آئی تو نہیں ۔ مگر دوست کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے تم ٹھیک ہی کہتے ہو ۔ کتنے ملائم چہرے ہیں ان کے لیکن دل پتھر کے ہوتے ہیں ۔

سعید : (فائر کرتا ہے) واہ وا ۔ نشانہ ٹھیک لگا

سلیم : کیا ملا تمھیں اس بے زبان کی جان لے کر ؟

سعید : قدرت نے یہ پرندے ہماری خوراک ہی کے لیے تو پیدا کیے ہیں پھر کیوں نہ ہم ان کا شکار کریں ۔

سلیم : نہیں سعید انھیں بھی جینے کا حق ہے ۔ ان خوب صورت وادیوں میں انھیں آزادی سے چہچہانے دو ۔ کوہسار کے پتھریلے سینے پر انھیں بے کھٹکے گھومنے دو ۔ یہاں کے سخت دل کتنے معصوم اور بھولے ہیں ۔

(موسیقی)

(رات کا سین ۔ پس منظر میں ہلکی موسیقی)

سلیم : ؎ میں بُلاتا تو ہوں اس کو مگر اے جذبۂ دل
اس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

شمّی : (دستک دے کر) بابو..... اے بابو.....
سلیم : (دروازہ کھول کر) شمّی..... تم..... اس وقت؟ اچھی تو ہو؟
شمّی : بابو تم ابھی سوئے نہیں۔
سلیم : نہیں شمّی..... مجھے نیند نہیں آئی..... تم بتاؤ بابا نے.....
شمّی : بابو اب میں یہاں دوبارہ نہ آسکوں گی۔ ناجو اور بابا سو گئے تھے میں چپکے سے چلی آئی۔ لیکن.....
سلیم : کیوں شمّی..... کیا کہا بابا نے؟
شمّی : یہ دیکھو.....
سلیم : مہندی۔
شمّی : ہاں بابو..... اور کل برات بھی آجائے گی۔
سلیم : لیکن شمّی۔ میں تمھارے انتظار میں.....
شمّی : کچھ نہ کہو بابو..... میں کچھ نہ سن سکوں گی مجھے.....
سلیم : شمّی اندر تو آؤ..... میری بات تو سنو۔
شمّی : نہیں بابو۔ میں اب زیادہ دیر ٹھہر نہیں سکتی۔ تم مجھے..... وہ.....
سلیم : تم گھبرائی ہوئی ہو شمّی..... آؤ..... اندر آجاؤ.....
شمّی : نہیں بابو..... تم مجھے وہ شیشی دے دو۔ میں کوشش کروں گی شاید کل کسی طرح آسکوں۔.....
سلیم : کل..... اچھا ضرور آنا شمّی..... میں تمھاری راہ دیکھوں گا۔
شمّی : لاؤ۔ اب وہ شیشی۔
سلیم : ابھی دیتا ہوں شمّی..... تم.....

(کھڑکی کا پٹ ہوا سے کھل جاتا ہے)

شمّی : ہائے بابو کون آیا ہے ؟
سلیم : کوئی نہیں شمّی ہوا سے کھڑکی کھل گئی ہے۔
شمّی : بابو مجھے بہت ڈر لگتا ہے اب دے بھی دو نا !
سلیم : گھبراؤ نہیں میں ابھی لاتا ہوں۔

(الماری کھلنے کی آواز)

شمّی : ہائے کیا تھا ؟
سلیم : کوئی بھی تو نہیں ..... لو یہ شیشی۔
شمّی : ہائے لاؤ دو ..... ہا .....
سلیم : بہت پسند ہے ؟
شمّی : ہاں بابو ...... بہت پسند ہے ...... بہت پسند ہے ...... بہت پسند ہے .....

(چلی جاتی ہے)

سلیم : ٹھہرو تو ..... شمّی ..... کل .....
چلی گئی ۔ ہا ..... شمّی ..... میری زندگی کے اندھیرے میں ایک شمع جلی اور گل ہو گئی۔

(موسیقی)

بابا : شمّی ..... کہاں گئی تھی ..... کہاں گئی تھی مُردار ..... ؟ چپ کیوں ہے ..... بول ..... کہاں تھی ؟
شمّی : کہیں نہیں بابا ..... میں تو ..... میں تو .....
بابا : میں تو کیا ..... جھوٹی ..... سچ بتا کہاں گئی تھی ..... بولتی کیوں نہیں ..... ٹھہر جا ..... تجھے ٹھیک کرتا ہوں (زور سے دھکّا

دیتا ہے) ادھر مر کم بخت.... تجھے شرم نہیں آتی۔

(شمّی گر پڑتی ہے۔ ہلکی سی چیخ۔ وہ شیشی جو قمیض میں چھپائی تھی ٹوٹ جاتی ہے)

بابا : میرا منہ کالا کر دیا تو نے۔ ابھی کل تیرے ہاتھ پیلے ہوئے ہیں۔ اگر انھیں اس کی خبر ہو جائے تو میں تو جیتے جی مر گیا..... اب وہاں ہی پڑی رہے گی.... اسے اٹھتی ہے یا نہیں....

شمّی : ہائے ہائے بابا....

بابا : اٹھ کم بخت.... بابا کی بچّی.....

(زور سے مار کر اٹھاتا ہے)

ہیں.... خون.... اِدھر دکھا....

شمّی : ہائے بابا....

بابا : ناجو.... او ناجو.... دیکھ اس کلموئی کے کہاں چوٹ آئی ہے.... ساری قمیض خون میں بھیگ گئی ہے۔

ناجو : شمّی شمّی.... کیا ہوا.... چوٹ کہاں لگی؟

(سونگھتے ہوئے)

یہ مہک کہاں سے آ رہی ہے؟

بابا : یہ مہک کیسی ہے ناجو.....؟ میں اس لڑکی کے ٹکڑے کر دوں گا..... اس نے مجھے کہیں کا نہیں رکھا۔

ناجو : (گھبرا کر) شمّی خون کہاں سے نکل رہا ہے؟ اور یہ مہک تیرے پاس کہاں سے آئی؟

شمّی : ہائے ناجو.... بابو سے کہہ دینا.... تم نے ٹھیک کہا تھا

مہک چھپ نہ سکے گی۔

: مہک........خون.....خون.... اور....مہک

.... یہ معاملہ کیا ہے ناجو.......؟

❖

پردیسی

(ڈرامہ)

کردار

بابا ...... بوڑھا ملاح

فضل ...... جوان ملاح

چھیماں ...... بابا ملاح کی جوان بیٹی

ریشماں ...... فضل ملاح کی جوان بہن

راشد ...... شہری نوجوان

خالدہ ...... راشد کی جوان بہن

ماں ...... راشد اور خالدہ کی ماں

نورا ...... ملازم

اور

ایک مسافر

(رات کا وقت - بوڑھے کے کراہنے کی
آواز - بادل کی گرج)

بابا : ہائے ! ہائے -

چھیماں : بابا ! کوئی آرام نہیں آیا ؟

بابا : نہیں بیٹا ! آج میرا کوئی پتہ نہیں.... ہائے.... ہائے....

چھیماں : بابا ! یوں نہ کہہ.... میں....

بابا : چھیماں ! میری بچی.... مجھے بھی تیرا ہی فکر ہے.... پر.... میں کیا کر سکتا ہوں.... ہائے.... اب تو آخری....

چھیماں : ہائے بابا ! یوں نہ کہہ....

(روتی ہے)

بابا : پگلی ہوگئی ہے چھیماں ؟ وہی تیرا رکھوالا ہے.... اِدھر آ، میرے پاس.... یہاں آکر بیٹھ.... نہ رو....

چھیماں : بابا ! بس ! ابھی تھوڑی دیر میں صبح ہوجائے گی اور کوئی نہ کوئی پار جانے والا آ ہی جائے گا.... ان بیبیوں سے میں دوا لے آؤں گی -

بابا : اچھا ! اگر خدا کو منظور ہوا.... ہائے ! آج مجھے تیری ماں کتنی یاد آرہی ہے.... بالکل ایسا ہی موسم تھا.... اسی طرح

بادل گرجتے تھے .... ہائے .... اس دن بھی دوا نہیں ملی تھی ....
اور .... وہ بے چاری ......

(روتا ہے)

چھیماں : بابا! میں آج سارا دن ..... دریا کے کنارے بیٹھ بیٹھ کر تھک گئی .... پر کوئی مسافر نہیں آیا ..... ریشماں بھی ناراض ہی ہے .... کہہ رہی تھی پہلے پچھلے پیسے دے پھر اور مانگنا۔

بابا : اچھا بیٹیا! تو میرے پاس بیٹھ جا ...... اگر آج کی رات بچ رہا تو ......

(بادل کی گرج)

چھیماں : بابا! یہ میری چادر بھی اوڑھ لے۔

بابا : تُو تو پہلے ہی کانپ رہی ہے .... ہائے .... ہائے ....

(دروازے پر دستک)

ہائے .... ہائے .... کون؟ .... اس وقت کون؟ .... دیکھ بیٹی چھیماں اس وقت کون آ گیا ہے؟

چھیماں : (دروازہ کھولتی ہے)

جی! .... کون؟ .... کون ہیں آپ؟

آواز : میں ایک پردیسی .... معاف کرنا .... مجھے اسی وقت پار جانا ہے .... آپ میری مدد کریں .....

بابا : (دُور سے)

نہ جی نہ .... ہائے .... لڑکی .... صبح چھوڑ آنا .... اس طوفان میں بڑے بڑے گھبرا جاتے ہیں۔

پردیسی : مجھے بہت ضروری جانا ہے ورنہ اس وقت کبھی تکلیف نہ دیتا... مَیں
...... تمھیں دس روپے دوں گا..... خدا کے لیے میری مدد کرو۔

چھمیاں : اچھا جی .... آپ چلیں.....

(دروازہ کھول کر)

وہ رہی میری کشتی.... میں آ رہی ہوں۔

بابا : چھمیاں بیٹی..... میری بات مان لے..... اس وقت نہ جا.....
میری حالت اچھی نہیں.....

چھمیاں : بس بابا ! بس ! آنا جانا ہی تو ہے..... دس روپے دے گا۔
صبح دوائی لے آؤں گی.... پھر تو اچھا ہو جائے گا۔

بابا : اچھا ہو جاؤں گا !..... صبح ...... دس .... روپے ....
یا اللہ .... تو ہی ..... میری ..... بیٹی کا.... محافظ ہے....

(چپّو چلنے کی آواز - بادل کی گرج اور
بجلی کی کڑک)

پردیسی : واہ ! جس کا کام اسی کو ساجھے۔

چھمیاں : جی ؟

پردیسی : یہ آپ ہی کا حوصلہ ہے۔ اتنی طوفانی رات میں اکیلے کشتی کھینا...

چھمیاں : آپ ڈرتے ہیں جی ؟ ہمیں تو پانی سے ڈر نہیں لگتا۔

(بادل کی کڑک)

پردیسی : اوہو کہیں برس ہی نہ جائے۔

چھمیاں : نہیں جی ! جب میں واپس پہنچ جاؤں گی تو برسے گا۔

پردیسی : مجھے بہت افسوس ہے مَیں نے اس وقت آپ کو تکلیف دی۔ میرا

کام بھی بہت ضروری ہے۔

چھمیاں : جی میرا کام بھی بہت ضروری ہے ۔ میں اپنے بابا کے لیے دوا لاؤں گی
آج صبح سے کوئی مسافر نہیں آیا تھا۔

پردیسی : دوا ..... ! جلدی میں معلوم ہی نہ کر سکا کہ تمھارے بابا بیمار ہیں۔
کیا ہوا ہے اسے ؟ کچھ دوائیں تو میرے پاس بھی ہیں۔

چھمیاں : بابا کو بخار ہے اور یہاں درد ہوتا ہے۔

پردیسی : کہاں ؟

چھمیاں : یہاں جی یہاں .... ہائے ! ہائے ! چپّو ہی چھوٹ چلا تھا
ہاتھ سے ....

پردیسی : اچھا ! اچھا ! مجھے پتہ چل گیا۔ پار جا کر میں دوا دوں گا۔

چھمیاں : آپ کتنے اچھے ہیں پردیسی !

پردیسی : پردیسی ؟

چھمیاں : ہاں جی ! اور کیا کہوں ؟

پردیسی : نہیں کچھ نہیں ! پردیسی ہی اچھا ہے — پردیسی — !

چھمیاں : شکر ہے — کنارا آگیا — لو جی ! اترو۔

پردیسی : یہ لو ..... دس روپے .... اور ٹھہرو .... میں دوا بھی
دے دوں۔

چھمیاں : پردیسی ! میں نے کہا ....

پردیسی : یہ لو ! آدھی دوا پلا دینا .... اور یہ دوائی مل کر روئی کا سینک
کر کے باندھ دینا ..... انشاءاللہ آرام آجائے گا۔

چھمیاں : اچھا جی ! آپ کی بہت بہت مہربانی .... اب میں واپس جاؤں ؟

پردیسی : تمہارا .... آپ کا نام کیا ہے ؟

چھیماں : کیوں ؟ میرے نام سے کیا ؟

پردیسی : کچھ نہیں .... میں آج سے آٹھویں دن واپس آؤں گا۔ اگر نام پتہ ہو تو آپ کی کشتی کا پوچھ لوں گا۔

چھیماں : اچھا ! اچھا ! پھر میرا نام ہے چھیماں ـ میرے ساتھ ہی پار چلنا ـ ایک بات میں آپ کو بتا دوں یہاں ایک جوان سا لڑکا ہے فضل ـ جب کوئی مسافر میری کشتی کی طرف آتا ہے تو وہ اسے اپنی طرف زبردستی لے جاتا ہے۔ میرا مطلب ہے کہ کہیں آپ بھی ....

پردیسی : نہیں چھیماں ! میں تجھے ڈھونڈ لوں گا۔

چھیماں : پردیسی ......

(کشتی چلنے کی آواز ـ کبھی کبھی بادل
کی گرج)

چھیماں : (بھاگتی ہوئی دروازہ کھول کر)

بابا ! بابا ! میں دوا لے آئی ـ پردیسی نے دی ہے .... اور کہا ہے آدھی دوا سے ہی آرام آ جائے گا .... بابا ! بابا ! تو بولتا کیوں نہیں .... بابا ! .... بابا ! ..... میں تو تیرے ہی لیے گئی تھی ..... یہ لے دس روپے ..... بابا ! ..... بول بابا ! ..... مجھے چھوڑ کر چلا گیا تو بابا ! .... بابا ..... !

(روتی ہے)
(غم ناک موسیقی)

(موسیقی فیڈ آؤٹ)

ریشماں : چھیماں ! آج تو بڑی سجی بنی لگ رہی ہے ؟ تیرے بابا کو آٹھ دن ہوئے ہیں مرے .... اور تو .....

چھیماں : میں بنی ٹھنی ہوں ؟ وہی کپڑے ہیں ..... بابا کا کھیس دھویا تھا تو یہ بھی ساتھ دھو لیے۔

ریشماں : ہاں ! میرا مطلب ہے .... مرنے والوں کے ساتھ کوئی مر تو نہیں جاتا ..... کہاں جا رہی ہے اس وقت ؟

چھیماں : پار — !

ریشماں : ارے ! کیوں ؟ خالی کشتی لے کر۔

چھیماں : ہاں ! ابھی آجاؤں گی۔

(چپوؤں کی آواز۔ دور سے کسی مانجھی کے گانے کی آواز)

پردیسی : (دور سے)

چھیماں ! چھیماں ! دیکھا ! میں نے تمھیں ڈھونڈ لیا۔ ایک گھنٹے سے انتظار کر رہا ہوں۔

چھیماں : میں بھی خالی کشتی لے کر آگئی ہوں۔

پردیسی : بابا کا کیا حال ہے ؟ میری دوا سے ضرور آرام آگیا ہوگا۔

چھیماں : دوا تو پڑی ہی رہ گئی۔

(رو کر)

بابا تو میرے پہنچنے سے پہلے ہی مجھے چھوڑ گیا تھا۔

پردیسی : نہ رو چھیماں ! قدرت کے آگے کسی کا کوئی زور نہیں۔ مجھے بہت

افسوس ہوا ہے۔ صبر کر۔ اب صبر کے سوا کوئی چارا نہیں۔

خالدہ : (دُور سے)
کشتی آ گئی ؟ اوہو..... یہاں تو باتیں ہو رہی ہیں..... کون ہے یہ ؟

پردیسی : یہی کشتی لے کر آئی ہے۔

خالدہ : مجھے وہاں دیر ہو گئی..... اس کھیت کے پار ایک جوگی جھوم جھوم کر بین بجا رہا تھا۔

پردیسی : (ہنس کر)
اچھا ! اچھا ! وہی لال لال آنکھوں والا ؟

خالدہ : ہاں ! اور اس کے ساتھ ایک لڑکی بہت ہی سریلا گاتی تھی ۔ میں اس کے گانے میں ایسی مگن ہوئی کہ مجھے پتہ ہی نہ چلا کہ.....

پردیسی : میں بھی کشتی کے ہی انتظار میں تھا۔

خالدہ : کشتیاں تو بے شمار ہیں۔

پردیسی : نہیں مجھے اسی کا انتظار تھا ۔ چلو ! بیٹھو ! پار چلیں..... چھیماں اُس دن مجھے ڈیوٹی پر پہنچنا تھا..... آج واپسی میں خالدہ بھی اتفاق سے مل گئی ہے ۔ یہ یہاں اپنے کالج کی طرف سے آئی تھی.....

چھیماں : (اپنے آپ سے)
یا اللہ ! میں کیوں آئی۔

خالدہ : کشتی والی ! کیا سوچ رہی ہے ؟ اکیلی چلائے گی ؟

پردیسی : ہاں ! خالدہ یہ لوگ بڑے دل والے ہوتے ہیں۔ چھیماں ! اداس نہ ہو..... اللہ کو یہی منظور تھا۔

خالدہ : کیوں جی! کیا بات ہے؟ تمھیں تو اس کا نام بھی آتا ہے۔

پردیسی : ہاں! بے چاری چھیماں.....

(دُور سے کسی ملاح کے گانے کی آواز)

چھیماں : لو جی! کنارا آگیا۔

خالدہ : کتنے پیسے؟

پردیسی : نہیں! نہیں! خالدہ رہنے دو.... یہ لو چھیماں....

خالدہ : دس روپے؟

چھیماں : نہیں جی! یہ آپ واپس.....

پردیسی : نہیں! نہیں چھیماں! لے لو..... میں تمھاری مدد کرنا چاہتا ہوں..... یہ لو....

چھیماں : بڑی مہربانی جی! جو مزدوری بنتی ہے وہی دے دیں.... اُس دن تو طوفانی رات تھی..... اور.... اب تو..... میرا بابا بھی نہیں ہے۔

خالدہ : رکھ لو.... کوئی بات نہیں....

پردیسی : ہاں! ہاں! رکھ لو۔

(رات کا سناٹا۔ دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز)

چھیماں : کون ہے؟

فضل : چھیماں! میں ہوں..... دیکھ اس وقت کتنی دُور سے چل کر صرف تجھے ملنے آیا ہوں۔

چھیماں : فضل! تو مجھے کیوں ستاتا ہے؟ مجھے میرے حال پر چھوڑ دے

جا! مجھے تنگ نہ کر۔

فضل : تُو تو پاگل ہے .... میں تجھے کیوں ستاؤں گا۔ مَیں تو تیرے ساتھ دل کی باتیں کرنے آیا ہوں .... چل .... شاباش! .... دروازہ کھول ....

چھیماں : دروازہ تو میں کبھی نہیں کھولوں گی۔

فضل : ضد نہ کر .... تو مجھ سے ڈرتی کیوں ہے؟ اور اب تجھے مجھ سے ملنے میں کیا حرج ہے ....

چھیماں : میں نے ہزار دفعہ تجھے کہا ہے کہ مجھے نہ ستا .... پر تُو باز نہیں آیا .... تجھے میرے حال پر ترس بھی نہیں آتا .... میرا کون ہے؟ جو تجھے پوچھے ....

فضل : تیرا تو میں آپ ہی ہوں .... لے اب دروازہ کھول دے۔

چھیماں : بس! تو مہربانی کر اور جا۔

فضل : جاؤں گا تو میں نہیں۔

چھیماں : تو دروازہ بھی نہیں کھل سکتا۔

(فضل دروازے پر گھونسے مارتا ہے)

ہائے اللہ! کیا مصیبت آ گئی ہے .... فضل تیرا بیڑا غرق ہو تو میرے پیچھے کیوں پڑ گیا ہے۔

فضل : آج اگر میں نے تیرا دروازہ نہ توڑا تو میرا نام بھی فضل نہیں .... ہم تیری اتنی چاہ کریں اور تُو سیدھے منہ سے بات بھی نہ کرے۔

(زور زور سے دروازہ توڑتا ہے)

چھیماں : فضل! فضل! (روتی ہے) دروازہ نہ توڑ .... مجھے بتا!

کیا کہتا ہے ؟

فضل : پھر سے تجھے ساری کہانیاں سناؤں۔ ایک دفعہ جو کہہ دیا کہ ہم تجھ پر مرتے ہیں۔ ظلم خدا کا تجھ پر کوئی اثر ہی نہیں ہوتا۔

چھیماں : مرتا ہے تو جا مر ... اور ... جو جی میں آئے کر ...

فضل : اچھا ! پھر نہ کہنا ... صبح ہی تماشہ دیکھ لینا ... نخرہ ہی نہیں پایا جاتا ... اپنا جو حمایتی ہے لے آنا ... دیکھ لوں گا۔

(بڑبڑاتا ہوا چلا جاتا ہے)

(میوزک)

ریشماں : فضل ! اس وقت آدھی رات گئے کہاں سے آیا ہے ؟ میں راہ تکتی تکتی سو گئی تھی۔

فضل : ہاں ! تو سوتی رہو۔ میں گم تو نہیں ہو گیا تھا۔

ریشماں : ہائے ! ہائے ! یہ کیسے بول رہا ہے ؟ کسی سے لڑ کے آیا ہے ؟ بتا تو سہی ! میں تیری بہن ہوں ... ہم دونوں بہن بھائی ایک دوسرے کا سہارا ہیں۔ مجھ سے ہی چھپائے گا ؟

فضل : میں گیا تھا اس بدبخت چھیماں کی طرف ... پر اس نے دروازہ ہی نہیں کھولا۔

ریشماں : ہائے ! بے چاری ... اکیلی جو رہ گئی ہے ... اس وقت دروازہ کیسے کھولتی ؟

فضل : کیسے کھولتی ... میں اسے کوئی کھا جاتا ... میں تو صرف یہی کہتا ہوں کہ اب اس کا کوئی نہیں رہا تو مجھے ہی اپنا بنا لے۔

ریشماں : ہاں ! ہاں ! یہ بات تو صبح بھی کہی جا سکتی ہے۔

فضل : پر تو اس کی کوئی وکیل ہے ؟ اس وقت یہ بات اسے کوئی کاٹتی تھی ؟

ریشماں : تو چپ کر میرے ویر . . . میں سویرے ہی اس سے پوچھوں گی ۔ لڑکی بڑی اچھی ہے اگر مان جائے تو تیرا گھر بس جائے گا ۔

فضل : وہ ماننے والی جنس دکھائی نہیں دیتی ۔

ریشماں : نہیں مانے گی تو سکھ سے وہ بھی نہیں رہ سکے گی ۔

فضل : اچھا ! بہن ! تیری مرضی ! تو بھی اپنی سی کہہ کے دیکھ لے ۔

(موسیقی ۔ صبح کا وقت ۔ پرندوں کے چہچہانے کی آوازیں)

ریشماں : چھیماں ! آج بڑی جلدی کنارے پر آ گئی ہے ؟

چھیماں : کیا کروں ؟ گزارہ تو کرنا ہی ہے نا . . . . بابا کا دم تھا وہ بھی نہ رہا . . . . کوئی مسافر مل جائے تو آٹا دال لے آؤں گی ۔

ریشماں : تو اتنی جان کیوں مارتی ہے ری ؟ کسی سے دو کلمے پڑھالے . . . . روز روز کی مصیبت سے نجات مل جائے گی ۔

چھیماں : کلمے پڑھانے والے مر گئے ۔

ریشماں : چھیماں ! اک بات کہوں ؟ غصہ نہ کرنا ۔

چھیماں : نہیں ریشماں ! غصہ کس بات کا ۔

ریشماں : تو خوب صورت ہے جوان ہے اور میرا بھائی فضل . . . . وہ بھی جوان گبھرو ہے ۔ تمھاری دونوں کی جوڑی کتنی اچھی لگے گی ۔ اگر تو کہے تو میں اس سے پوچھوں ۔ تجھے بھی سکھ مل جائے گا ہمارا بھی گھر بس جائے گا ۔

چھیماں : ریشماں ! خبردار ! فضل کی بات میرے ساتھ مت کر ۔

ریشماں : کیوں ؟ وہ کوئی چور ہے ٹھگ ہے ؟ .... فضل کی بات مت کر ......

چھیماں : اس میں غصے کی تو کوئی بات نہیں .... میں نے کہا نا ..... میں اکیلی اچھی ہوں۔

ریشماں : اکیلی اچھی ہوں .... بڑی معتبر بنی ہے .... کتنے دن اکیلی رہے گی آخر ایک دن تو کسی کو کرے گی .... میرے بھائی فضل سے .... کون سا اچھا ہے ؟

چھیماں : ریشماں ! مجھے نہ ستا ..... میں پہلے ہی بہت دکھی ہوں .... مجھے تنگ نہ کر .....

ریشماں : ابھی تو تجھے تنگ کیا ہی نہیں ..... اگر تو اپنی ہٹ سے باز نہ آئی تو دیکھنا ..... ہم کیا کیا کچھ کر سکتے ہیں۔

چھیماں : کیا کر لو گے میرا ؟ .... بھائی آتا ہے تو وہ ڈراتا ہے ..... بہن الگ دھمکاتی ہے .... جاؤ ..... جو جی چاہتا ہے کرو ! .... مجھے کسی کی پرواہ نہیں ہے۔

(دور سے کسی مسافر کی آواز)

مسافر : کشتی خالی ہے ؟

چھیماں : جی .... آئی ....

(کشتی چلنے کی آواز)

(فیڈ آؤٹ)

ریشماں : فضل ! آج میں نے چھیماں سے پوچھا تھا ....

فضل : اور اس نے نہ کر دی ــ ؟

ریشماں : وہ تو اس بات پر آتی ہی نہیں۔

فضل : میں نے تو پہلے ہی تجھ سے کہا تھا کہ وہ ماننے والی جنس نہیں ہے۔

ریشماں : میں نے بہت ڈرایا.... لیکن فضل.... بس! ایک دن کی مہلت اور دے دے.... میں اسے منا کر رہوں گی۔

فضل : وہ بڑی پکّی ہے۔ ماننے والی نہیں....

ریشماں : نہیں مانے گی تو وہ یہاں رہے گی بھی نہیں۔

فضل : رہنے دے بہن! تو اس کا کیا بگاڑ سکتی ہے؟

ریشماں : بگاڑ کیا سکتی ہوں؟ ایسا.... کروں گی کہ ڈر کے ہی مان جائے گی....

فضل : تُو تو پگلی ہے بہن! لڑکیاں کبھی ڈر کے بھی مانی ہیں؟

ریشماں : تُو رہنے دے..... بڑا آیا ہے لڑکیوں کی باتیں جاننے والا۔

فضل : اچھا بتا تو سہی.... کرے گی کیا؟

ریشماں : میں رات کو اس کی کشتی کھول دوں گی.... نہ کشتی رہے اور نہ کچھ کما سکے گی۔

فضل : یہ بات ٹھیک ہے۔

ریشماں : یہ تو بات ہی کچھ نہیں..... میں نے چھمیاں کے چھکّے نہ چھڑا دیئے تو میرا نام ریشماں نہیں۔

فضل : مان لیا بہن! مان لیا۔

ریشماں : فضل! میں تیرے لیے اس سے بھی بڑی باتیں کر سکتی ہوں۔ تُو میرا ایک ہی تو بھائی ہے..... اور... بھائی پر میری جان بھی قربان ہے۔

(شہر کی گہما گہمی - موٹر - تانگوں کی
آوازیں)

چھمیاں : یا اللہ! تو غریب تیموں کا آسرا ہے - میری کشتی کھول دی - گھر جلا دیا - اب سر چھپانے کو جگہ نہیں ہے - اس بڑے شہر میں آ گئی ہوں - تو ہی کوئی سہارا دے دے۔

(موٹر کے تیز چلنے کی آواز)

چھمیاں : معاف کرنا بھائی۔

لڑکا : اوہو ہو ہو... تو تو گر ہی گئی تھی - سڑک سے ہٹ کر چل۔ اس پٹڑی پر۔

چھمیاں : بھائی میں یہاں پہلی بار آئی ہوں - اگر کوئی چھوٹی موٹی نوکری ہو تو مجھے بتا دو۔

لڑکا : آؤ میرے ساتھ - جس کوٹھی میں میں کام کرتا ہوں - اس بیگم سے پوچھتے ہیں۔

چھمیاں : بھائی، مجھ غریب پر ترس کیا ہے - اس کا بدلہ تجھے خدا دے گا۔

لڑکا : اچھا بہن! اللہ کرے تجھے کام مل جائے - صبح ہماری بیگم کہہ تو رہی تھیں - تو یہاں ٹھہر! میں پوچھ کر آتا ہوں۔

(جاتا ہے)

چھمیاں : اے مہربان خدا! میری سن! اپنا ہاتھ بڑھا! مجھے ٹھکانہ مل جائے۔

لڑکا : آؤ! اندر آ جاؤ! ہماری بیگم نے تمھیں بلایا ہے۔

چھمیاں : شکر ہے اللہ..... (اندر پہنچ کر) سلام بی بی جی!

خالدہ : سلام..... ارے یوں لگتا ہے جیسے تجھے کہیں دیکھا ہے۔

چھیماں : جی ؟

خالدہ : اچھا ! تیرا کام گھر کی صفائی کرنا ہوگا.... اور..... برتن بھی مانجنے ہوں گے۔

چھیماں : جی میں یہ سب کام کروں گی۔

خالدہ : پہلے کبھی کام کیا ہے ؟

چھیماں : جی نہیں..... لیکن..... میں یہ سب کام بہت اچھی طرح کروں گی۔

خالدہ : ہم تمھیں پچیس روپے دے سکیں گے اگر منظور ہوں تو ابھی سے کام شروع کر دو۔

چھیماں : بی بی جی ! مجھے کوئی پیسہ نہیں چاہیے۔ مجھے تو صرف سر چھپانے کو جگہ اور آپ کا سہارا چاہیے۔

خالدہ : تمھارے ماں باپ ؟

چھیماں : جی اگر وہ زندہ ہوتے تو مجھے کیوں.....

(روتی ہے)

خالدہ : اوہو..... تیری شادی.... ؟

چھیماں : جی نہیں !

خالدہ : تیرا نام کیا ہے ؟

چھیماں : جی چھیماں۔

خالدہ : چھیماں.... چھیماں.... اچھا نورے ! اسے اماں کے پاس لے جا !

چھمیاں : بی بی جی ! بہت بہت مہربانی۔
خالدہ : فکر نہ کر چھمیاں .... نہ رو .... تُو یہاں خوش رہے گی۔
(کمرے میں جھاڑو دینے کی آواز۔
اور پھر چیزیں جھاڑنے کی آواز)
چھمیاں : ہیں .... یہ تصویر .... یہ تو بالکل پردیسی ہی ہے ....
لیکن نہیں .... پردیسی یہاں کہاں ؟
(تصویر گر کر ٹوٹ جاتی ہے)
ماں : (دُور سے)
ہائے ہائے چھمیاں .... پھر کچھ توڑ دیا ؟ کم بخت جب سے آئی ہے کھوئی کھوئی سی رہتی ہے۔
(نزدیک آ کر)
ہائے ہائے۔ کلموہی ! یہ تصویر توڑ دی ہے ؟ اتنے نقصان کیے ہیں تم نے .... کم از کم یہ تو نہ توڑتی۔
خالدہ : (دور سے آتے ہوئے)
کیا ہوا ؟ کیا ہوا ؟ اوہو ہو۔ بیڑا غرق..... اتنے بڑے بڑے دیدے ہیں لیکن ہے اندھی۔
ماں : ستیاناس .... میرا بیٹا تو پہلے ہی بہت دور گیا ہوا ہے۔
خالدہ : چلو اماں ! فکر نہ کرو .... اللہ انھیں سلامت رکھے۔
ماں : اری کم بخت ! یہ ٹوٹی کیسے ؟
چھمیاں : جی تصویر صاف کر رہی تھی۔ ہاتھ سے چھوٹ گئی۔
خالدہ : اب بٹ بٹ کیا دیکھ رہی ہے ؟ چل شیشے اٹھا....

ماں : اے ہے ... یہ لڑکی تو ہر وقت گم سُم ہی رہتی ہے۔

خالدہ : کھانے کو جو ملتا ہے۔ خاری چڑھی رہتی ہے۔

ماں : ہائے! میرا دل گھٹ رہا ہے۔

خالدہ : اماں! آپ آرام کریں .... کوئی وہم نہ کریں۔

نورا : (آتے ہوئے)

بی بی جی! بی بی جی! تار آیا ہے۔

ماں : ہیں؟ تار؟ کیسی تار؟ کس کی تار؟.... اللہ خیر کرے ..... خالدہ ..... جلدی بتا کیا لکھا ہے تار میں؟... مجھے ٹھنڈے پسینے آ گئے ہیں .... ہائے .... میرا پہلے ہی ماتھا ٹھنکا تھا .... اس چھمیاں کی بچّی نے میرے بیٹے کی تصویر .... ہائے ..... جلدی بتا خالدہ .... میرا دل گھٹ گیا ہے .... ہائے .... تار .... کہاں سے آئی ہے؟ ..... خالدہ ..... تو بولتی کیوں نہیں؟

خالدہ : اماں! اماں! ہوش کرو ..... آج شام کیپٹن صاحب گھر پہنچ رہے ہیں۔

ماں : سچ ....؟ یا اللہ ..... ! تیرا شکر ہے .... یا اللہ! تیرا شکر ..... میں تو تار کا سن کے کانپ گئی تھی ...... شکر ہے .... میرا لال آجائے گا۔

خالدہ : چھمیاں! او چھمیاں!

چھمیاں : آئی بی بی ..... (قریب آکر) جی؟

خالدہ : چھمیاں ..... ! آج میرے بھائی جان آرہے ہیں ..... یہ

دیکھ تارا ..... یہی تصویر والا کمرہ اچھی طرح صاف کر ......
تازے پھول لگا ..... سن رہی ہے ..... ؟ اوہ ... آج
میں کتنی خوش ہوں۔

چھیماں : بی بی جی ! کون سے کپتان .... کپتان ....

خالدہ : ارے میرا بڑا بھائی .... وہ بہت دُور گیا تھا ... یہی جس کی
تصویر کا شیشہ تجھ سے ٹوٹ گیا ہے۔

چھیماں : بی بی جی ! یہ آپ کا بھائی ....

خالدہ : ہاں ! میرا بھائی .... ہم دو ہی بہن بھائی ہیں ... چل ! چل
جلدی کر ... کمرہ ٹھیک کر .... اس کے آنے کا وقت
ہوا جا رہا ہے۔

ماں : (دُور سے)
خالدہ ! اب باتیں ہی بناتی رہے گی .... ؟ اُدھر خانساماں
کو بھی دیکھ !

خالدہ : اماں ! سب کچھ تیار ہو جائے گا ..... آپ فکر نہ کریں ...
چل ! چھیماں ! جلدی کر۔

(ہارن کی آواز)

ماں : خالدہ ! چھیماں ! نورے ..... دیکھو ... باہر گاڑی
آئی ہے۔

خالدہ : (بھاگتے ہوئے)
اماں ! اماں ! بھائی جان آ گئے۔

ماں : بسم اللہ ! بسم اللہ ! میرا بیٹا ماشاء ... ماشاء اللہ ....

راشد : ماں !

ماں : جیتا رہ بیٹا ! جیتا رہ ۔

راشد : ہیلو ! خالدہ ...... ! دیکھا ! کتنی جلدی پہنچ گیا ہوں ۔

خالدہ : بھائی جان ! شکر ہے .... آپ خیریت سے آ گئے ......
آج بڑا تماشا ہوا ...... جب آپ کی تار آئی ...... تو امّاں
کو ٹھنڈے پسینے آنے لگے ...... پھر انھوں نے آیت الکرسی
پڑھنا شروع کر دی ......

(دونوں ہنستے ہیں)

راشد : اوہ ! میری امّاں !

ماں : تمھیں کیا پتہ اولاد کیا ہوتی ہے ..... جب اپنے بچّے ہوں گے
پھر پوچھوں گی ۔

(سب ہنستے ہیں)

خالدہ : چھیماں ! او چھیماں ! اِدھر آ ...... صاحب کو سلام کر ۔

راشد : یہ چھیماں کون ہے ؟

خالدہ : ہم نے نئی نوکرانی رکھی ہے ..... آج اس سے آپ کی تصویر
گر کر ٹوٹ گئی .... تو بس ! .... امّاں کو اختلاج ہونے لگا
..... ہاں ! چھیماں ! یہ ہیں میرے بھائی ....

چھیماں : سلام صاحب !

راشد : چھیماں ! یہ نام تو تماشا ہوا ہے ۔

خالدہ : چھیماں ! بھائی جان کا سامان کمرے میں پہنچ گیا ہے ؟

چھیماں : جی بی بی جی .... نورے نے نہانے کا پانی بھی رکھ دیا ہے ۔

خالدہ : اٹھو ! بھائی جان ! پہلے سفر کی تکان اتار لو۔

راشد : نہیں بھئی ! ہوائی جہاز میں کیسی تکان . . . . .

ماں : چلو بیٹا ! ہاتھ منہ ہی دھو لو۔

خالدہ : چھیماں ! الماری میں سے صاف تولیہ نکال کر دے . . . . . میں باورچی خانہ تک ہو آؤں۔

چھیماں : یہ لیجیے تولیہ . . . . .

راشد : چھیماں ! تجھے کہیں دیکھا ہے۔

چھیماں : جی . . . . . !

راشد : تو کشتی والی چھیماں تو نہیں ؟

چھیماں : پردیسی . . . . . .

(میوزک)

☆

ساون

(فیچر)

کردار

نادرہ زرینہ حمیدہ ناہید	نوجوان سہیلیاں

امامن —— ادھیڑ عمر ملازمہ

اور

راوی

(کارواں کے دور سے نزدیک آنے کی
آواز۔ جلترنگ پر ملہار)

راوی : ساون کی سہانی رت اور کیف و بہار کا یہ موسم جب آتا ہے تو رنگ و بُو کا ایک کارواں ساتھ لاتا ہے۔ بادِ بہاری اٹھلاتے ہوئے اس کی آمد کا پیغام دیتی ہے۔ کائنات کے ذرّے ذرّے میں جوشِ نمو انگڑائیاں لینے لگتا ہے اور چپّے چپّے سے سرخوشی اور شادابی کے چشمے اُبل پڑتے ہیں۔ ساون کی کالی گھٹائیں کسی دوشیزہ کی سیاہ اور گھنیری زلفوں کی طرح ہوا کے دوش پر لہراتی اور اپنے سُرمئی دامنوں سے کیف و مستی کے خزانے لٹاتی ہیں۔ ہواؤں میں ایک نشہ سا گھل جاتا ہے۔ فضائیں مخمور ہوجاتی ہیں اور ہر طرف رنگینی و شباب کا ایک دریا موجیں مارنے لگتا ہے۔ کونپلیں پھوٹتی، شگوفے پھوٹتے اور کلیاں مسکراتی ہیں۔ پھول کھلتے ہیں۔ سرسبز درختوں کی گود پھلوں سے بھر جاتی ہے اور خوش نما جھاڑیوں اور پودوں کی جھولیاں پھولوں سے لبریز ہوجاتی ہیں۔ بلبل جوشِ مسرت میں چہکتی اور بھنورا مست ہوکر گنگناتا ہے۔ حسین اور شوخ تتلیاں فضا میں رقص کرتی اور ہوا میں رنگ بکھیر دیتی ہیں۔ درختوں پر پرندے مل جل کر اس طرح چہچہاتے ہیں گویا شاخوں میں گھنگرو بندھے ہیں۔

کوئل کوکتی ہے تو دل میں اک ہوک سی اٹھ جاتی ہے ۔ پپیہا پی کہاں کی رٹ لگاتا ہے اور بھولی بسری یادیں پھر تازہ ہو جاتی ہیں ۔ ابر بہار مستانہ وار جھومتا ہے ۔ اودے اور کالے بادل امنڈ امنڈ کر گھرتے ہیں پھواریں پڑتی ہیں مینہ موسلا دھار برستا ہے ۔ فضائیں دھواں دھار ہو جاتی ہیں ۔ بادل کی گرج اور کوندے کی لپک سے دل خوف وخوشی کے ملے جلے تاثرات سے دھڑکنے لگتا ہے ۔ ہوا کے معطّر اور خوشگوار جھونکے دل و دماغ پر ایک عجیب سی کیفیت طاری کر دیتے ہیں ۔

اس وقت فطرت بھی بزم عالم کی اس رعنائی اور آراستگی کو دیکھ کر ناز سے مسکرا دیتی ہے ۔ یہی وہ موسم ہے جب توبہ کی خیر نہیں ہوتی ۔ دیوانے تو دیوانے ہوشیار بھی بہکنے لگتے ہیں ۔ لوگ گھروں سے نکل کر باغوں اور سیرگاہوں کا رخ کرتے ہیں تاکہ کھلی فضا میں موسم کی رنگینی اور مناظر کی دل کشی سے زیادہ لطف اٹھا سکیں ۔

نادرہ : (دستک) زرینہ ۔ زرینہ ۔ بھئی اچھی رہی ۔ ہمیں تو رات بھر نیند نہیں آئی اور تم ہو کہ ابھی تک تیار بھی نہ ہو سکیں ۔

زرینہ : (دروازہ کھول کر) واہ وا بنّو ہمیں تم نے ایسا ہی سست سمجھ رکھا ہے

(دو تین لڑکیاں ہنستی ہیں)

نادرہ : ارے حمیدہ، ناہید تم سب یہاں ۔ میں تو سمجھی تھی .....

ناہید : ہاں ہاں کیا سمجھی تھیں تم ؟

حمیدہ : ہم تو سویرے ہی سے آگئے تھے بس تمھارا ہی انتظار تھا ۔

نادرہ : اچھا تو چلو ۔ دیکھو آج تو قدرت بھی ساتھ دے رہی ہے خوب گھر کر بادل آئے ہیں ۔

زرینہ : آہا مزا آجائے گا۔

نادرہ : بس اب تیار ہو جاؤ۔

ناہید : زرینہ! دوپٹہ کون سا نکالوں؟

حمیدہ : یہ فالسئی ٹھیک رہے گا۔

زرینہ : ارے کوئی سا بھی نکال دو۔

نادرہ : سنگار ختم بھی ہوگا یا نہیں؟

ناہید : صبح سے انھیں کوئی جوڑا پسند ہی نہیں آ رہا تھا۔ آخر یہ پسند آیا ہے۔

حمیدہ : بھئی یہ پسند کیوں نہ آتا۔

نادرہ : اوہو۔ انور بھائی جو پسند کرتے ہیں اسے۔

(سب ہنس دیتی ہیں)

زرینہ : بھئی دیکھو ایسی باتیں کروگی تو ہم نہیں جائیں گے۔

نادرہ : اب اٹھ بھی چکو یہاں انور بھائی نہیں ہیں جو ناز اٹھائیں گے۔

امامن : بی بی جی! یہ تار آیا ہے۔

زرینہ : تار — ادھر لاؤ۔

ناہید : الٰہی خیر ہو۔

نادرہ : کیوں — کس کا تار ہے؟

حمیدہ : ارے زرینہ خاموش کیوں ہو گئیں۔

نادرہ : ادھر دکھاؤ..... واہ وا دل میں لڈو پھوٹ رہے ہیں اور بڑی بن رہی ہیں۔ ارے سنتا ناہید حمیدہ — لو وہ آ رہے ہیں — آج شام کی گاڑی سے۔

ناہید : وہ ۔ ہُرّے ۔ ۔ ۔ ۔

حمیدہ : اب پکنک کا مزا آئے گا ۔ مَیں تو رات کو دعائیں مانگ رہی تھی، کہ انور بھائی آ جائیں اور زرینہ خوش ہو جائیں ۔

نادرہ : ہاں بھئی اس خوب صورت موسم میں تو انھیں آنا ہی چاہیے تھا ۔

زرینہ : ہمیں نہیں اچھا لگتا یوں ۔

نادرہ : اچھا نہیں لگتا ۔ دیکھوں ذرا ۔ دل پر ہاتھ رکھ کر کہنا ۔

زرینہ : نہیں بھئی نہیں نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

(لڑکیاں گدگداتی اور ہنستی ہیں)

نادرہ : اچھا چلو باہر موٹر تیار کھڑی ہے پھر واپس بھی جلدی آنا ہو گا ۔ اب چلو نا !

ناہید : ہاں زرینہ کو استقبال کی تیاری بھی تو کرنی ہو گی ۔

حمیدہ : چلو یہ سب چیزیں موٹر میں رکھیں ۔

زرینہ : امامن کو بلاؤ اور چلو اور ہاں ڈھولک نہ بھولنا ۔

ناہید : کیوں بھولیں گے ۔ ڈھولک کے بغیر کیا خاک مزا آئے گا ۔

زرینہ : امامن جھولے کا رسّہ اور دری بھی لے لی ہے نا ؟

امامن : جی ہاں بی بی ۔

(موٹر چلنے کی آواز ۔ پھر موٹر رکتی ہے ۔ باغ کے ایک حصے میں پرندوں کے بولنے کی آواز)

نادرہ : واہ وا کیا سماں ہے ۔ میرا خیال ہے یہ جگہ ٹھیک رہے گی ۔

زرینہ : ہاں ہاں ٹھیک ہے ۔ یہیں اس درخت میں جھولا ڈالو ۔

حمیدہ : اچھا تو پھر بنو بندر ۔ (سب کی ہنسی)

زرینہ : کس کے باندھنا، جھولتے میں رسّہ کھسک گیا تو ہڈی پسلی ایک ہو جائے گی......

حمیدہ : لو بھئی جھولا تو پڑ گیا۔ پہلے کون جھولے گا ؟

ناہید : میں !

نادرہ : نہیں میں !

زرینہ : ارے لڑتی کیوں ہو۔ نہ تم، نہ تم، پہلے ہم جھولیں گے۔

(سب ہنستی ہیں۔ جھولنے کی آواز اور بادل کی گرج)

ناہید : ارے توبہ توبہ تُو تو سامنے والے درخت کے پتوں کو چھو آئی۔ مجھ سے تو اتنی پینگ نہیں بڑھے گی۔

حمیدہ : یوں مزا نہیں آئے گا۔ وہ ڈھولک کہاں گئی۔

نادرہ : وہ رہی اماّمن — اری اماّمن ذرا یہ ڈھولک تو دے جا۔

: میں تو تھک گئی لو اب تم جھولو۔

(بادل کی گرج)

حمیدہ : آہاہا کیسی گھر کے آئی ہے۔

ناہید : اب میری باری ہے۔

نادرہ : ارے یہ تو برسنے لگا۔ چلو اس سامنے والے درخت کے نیچے چلیں۔

ناہید : ہاں ہاں بھاگو۔ بہت گھر کر آیا ہے۔ کیسی موٹی موٹی بوندیں پڑنے لگیں۔

حمیدہ : ارے ذرا اماّمن کو دیکھنا مالی کے جھونپڑے میں کیسے چیزیں اٹھائے لیے جا رہی ہے۔

زرینہ : میرا خیال ہے اس بارہ دری میں بھاگ چلیں۔ اماّمن پکوان تل چکی ہے کچھ کھا بھی لیں گے۔

نادرہ : ارے یہ تو اور زور سے برسنے لگا۔ اوئی میرے سر پر ایک بڑی سی بوند گری ہے۔

(سب بھاگتی ہیں، اوئی ہائے کی آوازیں)

زرینہ : ہائے میں تو پھسلتے پھسلتے بچی۔

نادرہ : چلو ذرا اماّمن کے ساتھ چیزیں اٹھوا لائیں۔

حمیدہ : بھیگ جاؤ گی۔

زرینہ : نمک تھوڑے ہیں جو گھل جائیں گے۔

(سب ہنستی اور بھاگتی ہوئی دُور چلی جاتی ہیں)

نادرہ : پکڑنا۔ پکڑنا۔ ہائے . . . . یہ طشتری پکڑنا۔

حمیدہ : لاؤ لاؤ۔ اِدھر یہاں دری پر رکھ دو۔

زرینہ : اوئی اللہ میری انگلی۔ بہتیرا دوپٹہ آگے کو کیا مگر ہزاروں جتنوں میں سے بھی انگلی جل گئی۔

نادرہ : اری مری کیوں جا رہی ہو انور بھائی سے کہنا وہ دوا لگا دیں گے۔

(سب کی ہنسی، بارش اور بادل کے گرجنے کی آواز)

ناہید : کیسی سوندھی سوندھی خوشبو آ رہی ہے۔

(گرج)

حمیدہ : اوئی دل ہل گیا۔

نادرہ : بھئی زرینہ! سب چیزیں آ گئی ہیں۔ اب کھانے کو تب ملے گا، جب

گانا سناؤں گی۔

حمیدہ اور ناہید : ہاں ہاں۔

زرینہ : اچھا بھئی تم کب مانو گی۔ لو سنو !

چھما چھم مینہ کی بوندیں گر رہی ہیں

کہ ساون کی پری کچھ گا رہی ہے

(گانا)

نادرہ : واہ وا نقشہ کھینچ دیا ہے۔

ناہید : ہائے آواز ہے کہ بس انور بھائی ......

زرینہ : ٹھہر تو جا بہت شریر ہو گئی ہے تو ناہید ....

امامن : لڑکیو ! اب کچھ کھا بھی تو لو۔ پکوان ٹھنڈا ہو رہا ہے۔

حمیدہ : مجھے تو یہ امرتیاں بہت پسند ہیں۔

زرینہ : یہ گلگلے اور پھلکیاں بھی تو لو۔

نادرہ : امامن آم کہاں ہیں ؟

حمیدہ : اور جامنیں بھی۔

امامن : ابھی لائی بی بی !

ناہید : اب کھاتی ہی رہو گی۔ میں تو ڈھولک بجاتی ہوں۔

نادرہ : میں یہ گلاس بجاؤں گی۔

زرینہ : سب مل کر گائیں گے۔

(موسیقی)

(بادل کی گرج - زور سے بوچھاڑ آتی ہے - ہوا سے دری کا ایک کونہ اڑ کر کسی لڑکی کے سر پر گرتا ہے)

زرینہ : اوئی اللہ۔ پکڑو ناحمیدہ یہ دری اُڑ کر میرے سر پہ آگری ہے۔

ناہید : ہائے اس زور کا چھینٹا آیا ہے کہ سب طشتریاں بھیگ گئی ہیں۔

امامن : بیٹی ادھر دیوار کے پاس سرک آؤ۔ ہوا اِدھر کی ہے۔

نادرہ : بارش تو اب ہلکی ہے لیکن بادل دھواں دھار آ رہے ہیں۔

حمیدہ : ذرا تھمے تو پھر جھولیں۔

امامن : بیٹی اب رہنے دو۔ پھسلن ہو رہی ہے کہیں پاؤں نہ پھسل جائے۔

ناہید : امامن تم بھی تو جھولو۔ ہم تمھیں ضرور جھلائیں گے۔

امامن : نہیں بیٹا! اب ہماری عمر اس قابل کہاں۔ جب میں تمھارے برابر تھی، جب بات تھی، اب تو .....

زرینہ : امامن تم بھی ہماری طرح پینگ پہ پاؤں سے پتّے چھو لیتی تھیں؟

(سب کی ہنسی)

امامن : ہاں بیٹی۔ ہم صبح ہی صبح اٹھ کر گھر کے کام کاج سے فارغ ہو جاتے۔ پھر سب سہیلیاں مل کر باہر باغوں میں نکل جاتیں۔ جیبوں میں چنے بھر لیتے اور دن بھر کُرڈ کُرڈ چباتے رہتے۔ ایک موٹے سے رسّے کا جھولا ڈالتے۔ کھیر پکتی۔ مال پوے تلتے۔ اِدھر کھایا اُدھر ہضم۔ خون چُلّو وں بڑھتا تھا۔ یوں بھاگتے پھرتے اور سارے کھیتوں میں خوب آنکھ مچولی کھیلی جاتی۔ ایک دوسرے پر آم کی گٹھلیاں پھینکتے۔ جان جان کر گرتے، اُٹھتے، ہنستے اور کھیلتے۔

زرینہ : شادی کے بعد بھی یونہی کھیلتی تھیں کیا؟

امامن : بیٹی میری شادی تو اس وقت ہوئی تھی جب مجھے ہوش بھی نہ تھا دو برس کی تھی جب ماں نے منگنی کر دی تھی۔

زرینہ : ارے دو برس کی۔ اور دولہا میاں کتنے بڑے تھے؟

امامن : وہ.... وہ کوئی سات برس کے ۔

نادرہ : پھر تو تمھیں گود میں اٹھائے پھرتے ہوں گے ۔

(سب کی ہنسی)

امامن : جب بارہ برس کی ہوئی تو رخصت ہوئی اور سسرال جانا پڑا ۔ مجھے یاد ہے کہ اس روز ایسا موسلا دھار برسا تھا کہ ڈولے کے اندر میں تر بتر ہوگئی تھی ۔

زرینہ : اب معلوم ہوا خوب ہانڈیاں چاٹی ہوں گی ۔

(سب کی ہنسی ۔ بادل کی گرج)

امامن : نہیں بیٹی یہ ہانڈیاں چاٹنا تو یونہی بات بن گئی ہے ۔

زرینہ : نہیں بات کیوں ۔ ہم نے تو آزما کر دیکھا ہے ۔

حمیدہ : تمہاری بارات جو بھیگی تھی ۔

(ہنسی)

نادرہ : امامن اچھا پھر کیا ہوا ۔ جب تم ڈولے میں سے اتریں تو ؟

امامن : جب میری ساس نے ڈولے سے مجھے اتارا تو میں بھیگ کر چوہڑا ہو رہی تھی سسرال والوں نے خوب مذاق اڑایا ۔ کوئی ایک ہفتے کے بعد پہلا ساون لگا ۔ مجھے سرخ جوڑا پہنایا گیا ۔ ہری اور لال چوڑیاں ہاتھوں میں ڈلوائیں ۔ گاؤں کے باغ میں گئے ، جھولے جھولے ۔ پکوان پکے ۔ لڑکیوں نے ملہار گائے ۔

ناہید : اوہو ۔ امامن کی باتوں میں مینہ بند ہو گیا ہے ۔ اب تو ہلکی ہلکی پھوہار پڑ رہی ہے ۔ چلو جھولیں ۔

حمیدہ : چلو چلیں ۔ چلو امامن تم بھی ۔

(سب کی ہنسی)

(FADE OUT)

راوی : شہر کی حدود سے دُور دیہاتوں میں ساون کی بہار کچھ اور بھی دل فریب ہوتی ہے۔ کھلے میدانوں میں ہر طرف سبزہ ہی سبزہ نظر آتا ہے۔ کھیت لہلہاتے ہیں۔ جھیل اور تالاب لبریز ہو جاتے ہیں۔ ندّیاں اونچے سُروں میں گاتی ہیں۔ کوئل بہیم اور بے تابانہ کُوکتی ہے مور چلّاتے ہیں۔ بنوں میں زندگی کی لہر دَوڑ جاتی ہے۔ جنگل میں منگل ہوتا ہے۔ اِن بستیوں کی گود میں بسنے والے بے تکلّف انسان سادہ اور پُر جوش طریقوں سے ساون کی خوشیاں مناتے ہیں۔ بچّے، بوڑھے، جوان، مرد، عورت سب کے سب خوشی میں مگن نظر آتے ہیں۔ لڑکے بالے ٹولیاں بنا بنا کر گلیوں میں گھومتے اور چیخ پکار سے گاؤں کو سر پر اٹھا لیتے ہیں۔ نئی نئی شرارتیں سوجھتی ہیں۔ ایک دوسرے کو چھیڑتے ہیں۔ کیچڑ اچھالتے ہیں۔ پھر ندّی کے کنارے ایک میلہ سا لگ جاتا ہے لوگ چھلانگیں لگاتے، نہاتے اور تیرتے ہیں۔

(لڑکوں کے شور کی آواز۔ بادل کی گرج)

کالیاں اِٹّاں کالے روڑ

مینہ وسا دے زور و زور

ربّا ربّا مینہ وسا

ساڈی کوٹھی دانے پا

نائیاں دی کوٹھی ڈڈو پا..........

برکت : او بھجیائیں اوئے۔ او بابا لبھّا لڑیا آؤندا ای۔ چلو اودھرے اُتّے گار اسٹیئے فیر نھبا ورہے گا۔

بہت سے لڑکے : چلو۔ چلو۔

(لڑکوں کے قہقہوں کی ملی جلی آوازیں)

: اوہو.... ہوہو.... اوئے شیطانو مینوں بڈھے ٹھیرے نوں پھر دتّا جے۔ اوئے کم بختو..... اوہ تہاڈا ککھ نہ رہے۔ تہاڈی بیڑی غرق ہو جائے۔

(بارش اور بادل کی آواز)

: اور گاؤں سے باہر کھیتوں میں سجیلے اور بے فکر چرواہے بنسری پر خوشی کے راگ چھیڑتے ہیں۔ بادل جھوم جھوم کر آتے ہیں۔ دل میں نئی نئی امنگیں کروٹیں لینے لگتی ہیں۔ ارمان مچلتے ہیں اور انگڑائیوں کی صورت میں ڈھل جاتے ہیں۔ گاؤں کی الھڑ دوشیزاؤں کے جھرمٹ کنوؤں پر اکٹھے ہوتے ہیں۔ ان کے رنگ برنگے آنچل سروں سے ڈھل کر ہوا میں لہراتے ہیں۔ نقرئی قہقہوں سے فضا گونج اٹھتی ہے۔ جھولے پڑتے اور پینگیں بڑھتی ہیں۔ سب مل کر ساون کے گیت گاتی ہیں۔

(موسیقی)

آخر کار بہار ختم ہوتی ہے اور رنگ و بو کا یہ کارواں شادابی اور خوش حالی کے بے بہا خزانے چھوڑ کر روانہ ہو جاتا ہے۔ اس کی عشرتوں اور مسرّتوں کی یاد ایک عرصے تک دلوں کو گرماتی رہتی ہے اور دنیا والے بے چینی سے پھر ساون کی اس سہانی رُت کا انتظار کرتے ہیں !

(کارواں کا میوزک — فیڈ آؤٹ)

٭

میرا وعدہ

(ڈائری کا ایک ورق)

کردار

عورت

مرد

اور

راوی

(ریل گاڑی دُور سے آتی ہے پھر رُک جاتی ہے
سٹیشن کا تاثّر)

راوی : سفر، ہر وقت سفر، یہ مسافت کبھی ختم نہ ہو گی لیکن اس میں بھی ایک راحت ہے - ایک سکون ہے - کبھی میدان، کبھی کوہسار، کبھی صحرا - اس وقت مَیں ایک سرائے میں بیٹھا ہوں - مجھے یہاں آئے ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی ہے - آس پاس کا ماحول خوبصورت ہے - سامنے کے دروازے پر پھولوں کی بیلیں چڑھی ہیں - کمرہ جو مَیں نے اپنے چند دن رہنے کے لیے پسند کیا ہے - یہ اوپر کی منزل میں ہے - سامنے دیوار پر جنگل کے ایک حصّے کی پینٹنگ ہے - فرش پر چیتے کی کھال ایک طرف بچھی ہوئی ہے - شام کے دھندلکے بڑھ رہے ہیں - سفر کی تکان دور کرنے کے لیے مَیں نے یہاں کا مشہور قہوہ پیا ہے - ابھی میری میزبان کھانا لائے گی - مَیں نے چند لمحوں میں اسے جان لیا ہے - وہ اداس سی نظر آتی ہے یا شاید وہ بھی تھک گئی ہو - اتنی بڑی سرائے اور وہ بھی سرِ راہ ہے - اس کا سارا انتظام وہ خود چلاتی ہے - اسے سرائے کہنا تو شاید اتنا درست نہ ہو کیوں کہ سرائے سے ایک غریبانہ سا ماحول ذہن میں آتا ہے - ہوٹل بھی اسے نہیں کہہ سکتے -

بس ہوٹل اور سرائے کے درمیان ہی سمجھ لیجیے۔ اچھے خاصے کشادہ کمرے ہیں۔ پانی کا انتظام بھی ٹھیک ہے۔ لوگ بھی، میرا مطلب ہے یہاں ٹھہرنے والے عام لوگ نہیں ہیں۔ جنگل اور ندّی نزدیک ہونے کی وجہ سے عام طور پر شکاری آتے ہیں۔

لیجیے میری میزبان یعنی سرائے کی مالکہ ایک بیرے کے ساتھ آ رہی ہے۔ بیرے نے ٹرے اٹھا رکھی ہے۔ اب وہ میرے کمرے میں پہنچ گئے ہیں۔ میں حسب عادت ڈائری لکھ رہا ہوں لیکن چند لمحوں کے لیے بند کر دوں گا۔ کھانا کھا کر پھر لکھنا شروع کر دوں گا کیوں کہ میری روح کی غذا ڈائری لکھنا ہی ہے۔ میں اس کے بغیر سو نہیں سکتا۔

(میوزک)

مجھے یہاں آئے کافی دن گزر گئے ہیں۔ موسم بہت اچھا ہے۔ لوگ اچھے ہیں۔ مَیں سب کے ساتھ خاصا بے تکلّف ہو گیا ہوں میری میزبان بہت ہی اچھی ہے۔ میں ادیب ہوں۔ مشاہدے کی قوّت مجھ میں قدرے زیادہ ہے۔ میں نے یہاں زندگی کے مختلف پہلو دیکھے ہیں۔ زندگی میں سیماب کی سی کیفیت بھی ہے، ٹھہراؤ بھی ہے۔ اِدھر آگ ہے تو اُدھر ٹھنڈ سے کپکپاہٹ بھی۔

میں نے اپنی میزبان کی آنکھوں میں پہلے ہی دن جھانک لیا تھا اور میرا اندازہ درست نکلا۔

ادھیڑ عمر کی ..... نام کی ضرورت نہیں۔ وہ عورت ہے بس ایک عورت۔ ادھیڑ عمر کی اس خوش شکل عورت نے مجھے بتایا

بلکہ میں نے خود اس سے معلوم کر لیا - یہ سرائے اس کا اپنا گھر ہے - اس کے خاوند نے یہ خوب صورت گھر اس کے لیے بنوایا تھا - اب ضرورت کے مطابق اس میں ترمیم بھی کر دی گئی ہے اور زیادہ مسافروں کے رہنے کی جگہ کا انتظام ہو گیا ہے - ہر کمرہ سجا سجایا ہے - یہاں ایک چیز مَیں نے خاص دیکھی ہے کہ ہر کمرے میں ہرن، نیل گائے، شیر اور ریچھ کے سر دیواروں پر لگا رکھے ہیں -

میری میزبان کی سکھیاں کبھی کبھی آتی ہیں جو یہاں ہی دُور و نزدیک کے شہروں میں آباد ہیں - میرے سامنے ایک دن وہ آ گئیں تو مجھے اپنی ڈائری کے لیے زندگی کے زیر و بم کا ایک موضوع مل گیا - میری توقع سے الگ لیکن میرے تجسس کا جواب -

آج سے بیس برس پہلے یہ عورت اپنی سکھیوں کے ساتھ ہنستی کھیلتی، گاتی ناچتی پھرتی تھی - جنگل کی ہرنیوں کی طرح، کہ اچانک اسے ایک مرد ملا :

مرد : رک جا ..... او .... رک جا !

عورت : کیوں رک جاؤں ؟

مرد : میں تنہا ہوں -

عورت : مجھے کیا -

مرد : تم میرے ساتھ چلو -

عورت : کہاں ؟

مرد : فضا کی وسعتوں میں -

عورت : وہاں ؟

مرد : ہاں۔

عورت : لیکن ؟

مرد : وہاں پیار ہے۔

عورت : اور رنگ۔

مرد : اور سُر

عورت : (ہنستی ہے)

(میوزک)

(پرندوں کی آوازیں وغیرہ)

عورت : آہا !

مرد : کیا ؟

عورت : پھول۔

مرد : چاروں طرف پھول معطّر ہوا۔

عورت : سہانی شام۔

مرد : اور آگے بڑھیں ؟

عورت : ہوں — میری سکھیاں ؟

مرد : کہاں ؟

عورت : سنبل اور چنار کے پیچھے۔

مرد : کدھر ؟

عورت : سَرو کی اوٹ میں۔

مرد : چھوڑو !

عورت : نہ ۔۔۔۔ نہ ۔۔۔ وہ ۔۔۔ وہ ۔۔۔

مرد : خوش ہیں۔

عورت : ساتھ لے لیں ؟

مرد : کیوں ؟

عورت : سنو !

(موسیقی)

(چند لڑکیوں کی ملی جلی آوازیں)

مرد : (سُن کر) لفظ ہی لفظ۔

عورت : سُر۔

مرد : ہاں سُر۔

عورت : سُر اور لفظ۔

مرد : لفظ۔ بے معنی۔

عورت : نہیں۔ کتنے سچّے۔

مرد : ہاں۔ سکھیوں کے لفظ۔

عورت : میرے جذبات کے ترجمان۔

مرد : تم.... خود بھی کہو۔

عورت : کیا ؟

مرد : کچھ ہوا.... کیا ہوا.... کیسے ہوا ؟

(موسیقی)

مرد : مدھر سنگیت

عورت : بس سنگیت ؟

مرد : میٹھے سُر.... اور....

عورت : سُر اور ... اور کیا ؟

مرد : نشہ

عورت : (خوش ہو کر) نشہ ... کیسا ؟

مرد : سُر اور لے کے ملاپ کا۔

عورت : سُر اور لے کا ملاپ ! بس۔

مرد : بھولی سی ... لیکن ...

عورت : لیکن ؟

مرد : کتنی ... میری ...

عورت : ہنہ ... مجھے نہیں پتہ۔

مرد : کچھ تو کہو۔

عورت : میری سکھیوں سے پوچھ لو۔

مرد : تو آؤ۔

(دور سے نزدیک آتی ہوئی آواز۔ ہنسنا)

مرد : سُن لیا تم نے ؟

عورت : ہاں !

مرد : یہ تو خوش ہیں۔

عورت : ہاں !

مرد : اور تم ؟

عورت : مَیں ؟

مرد : ہاں ! تم۔

عورت : مَیں بھی۔

مرد : خوش ہونا ؟

عورت : (ہنستی ہے)

مرد : دو انجانے دل

عورت : ایک ہو گئے ؟

مرد : عمر بھر کے ساتھی۔

عورت : میری ساتھی۔ میری سکھیاں۔

مرد : ان کا ساتھ چھوٹ گیا۔

عورت : ساتھ چھوٹ گیا ؟ کیوں ؟

مرد : دستور یہی ہے۔

عورت : اور مَیں ۔ اِن کے ساتھ۔

مرد : ان کے ساتھ جانا۔

عورت : ہاں !

مرد : نہیں ! اب تم ۔ میرے ساتھ۔

عورت : مَیں ۔ واپس۔

مرد : اب ہم دونوں ان سے ملنے آیا کریں گے۔

عورت : کب ؟

مرد : کبھی کبھی۔

عورت : میری سکھیاں۔

مرد : وہ بھی باری باری چلی جائیں گی۔

عورت : کہاں ؟

مرد : پی کے انگنا۔

عورت : (سِسکی بھرتی ہے)

مرد : رونے لگیں؟

عورت : نہیں ۔ دل بھر آیا۔

مرد : ہمت نہ ہارو......آؤ !

عورت : کہاں ؟

مرد : وہ دیکھو ! تمھاری سکھیاں۔

عورت : میری سکھیاں؟

مرد : تمھاری ہمراز ۔ تمھیں وِداع کرنے آ رہی ہے۔

عورت : (روتی ہے)

مرد : وہ تو خوش ہیں۔ تم کیوں روتی ہو ؟

عورت : ہَیں۔

مرد : چلو آؤ !

(میوزک)

مرد : یہ جگہ پسند ہے۔

عورت : بیگانہ ماحول۔

مرد : مگر اپنا۔

عورت : خوشبو، معطّر فضا ۔ اور

مرد : اور مَیں۔

عورت : ہاں ۔ تم۔

مرد : تم اور مَیں۔

عورت : میں اور تم۔

راوی : مرد اور عورت ۔ دنیا کے دستور کے مطابق سنگ سنگ رہنے لگے۔ کئی موسم آئے اور چلے گئے۔ ان کے پیار میں اضافہ ہی ہوا۔ یہ خوب صورت گھر بنایا گیا۔ دوستوں کے جمگھٹے، سہیلیوں کی ملاقاتیں بڑھنے لگیں۔ سرِراہے جنگل میں منگل کا سماں ہو گیا۔ ندی اور جنگل قریب ہونے سے پکنک کے پروگرام بنتے۔

(عورت کے ہنسنے کی آواز۔ جیسے ایک دوسرے کو پکڑ رہے ہیں)

عورت : بس تھک گئے؟

مرد : نہیں ٹھہرو۔

عورت : پکڑ لو !

مرد : اے .... یہ .... یہ رہا۔

عورت : نہیں .... چھو بھی نہیں سکے۔

مرد : تھک گئی ہو؟

عورت : تم خود تھک گئے ہو۔

مرد : مرد کبھی نہیں تھکتا۔

عورت : (ہنس کر) سانس تو پھول رہی ہے۔

مرد : تمھیں دکھانے کو۔

عورت : اب پکڑو !

مرد : اے .... یہ .... یہ پکڑا۔

(دونوں ہنستے ہیں)

عورت : اچھا اب چھوڑ دو .... لو اب پکڑو۔

مرد : یہ شوق بھی پورا کر لو۔

(بھاگتی ہے)

مرد : جتنا جی چاہے بھاگ لو۔

عورت : پھر ؟

مرد : تمھیں پکڑ لوں گا۔

عورت : (ہنستی ہے)

مرد : ارے ارے پانی۔

عورت : کہاں ؟

مرد : بچو بچو۔ سامنے۔

عورت : ہائے۔

(پانی میں گرتی ہے)

مرد : ہاتھ بڑھاؤ !

عورت : لو پکڑو !

مرد : آگے بڑھو۔

عورت : ہائے اللہ تھامو۔

مرد : اب وہیں رہو۔

عورت : اور تم ؟

مرد : میں یہاں۔

عورت : کیوں کر ممکن ہے ؟

مرد : (ہنستا ہے)

عورت : (روکر) نکالو مجھے۔

مرد : اب بُلاؤ اپنی سکھیوں کو۔

عورت : میری سکھیاں۔

مرد : ہاں۔

عورت : کہاں ؟

مرد : بچھڑ گئیں۔

عورت : اور تم ....

مرد : میں تمھارے ساتھ۔

عورت : ہاتھ تھامو !

مرد : آؤ !

(ہنستے ہیں)

مرد : ادھر دیکھو !

عورت : کہاں ؟

مرد : درختوں کے جھنڈ میں۔

عورت : پھولوں کے کنج میں۔

مرد : ہا — پھول ہی پھول۔

عورت : مہک ہی مہک۔

مرد : تمھارے ساتھ۔

عورت : (ہنستی ہے)

مرد : ایک سکون۔

عورت : ابدی راحت۔

مرد : دل کا دل سے ملنا۔

عورت : تم اور میں۔

مرد : میں اور تم۔

(ہنستے ہیں)

راوی : یوں ہنسی خوشی میں ایک عرصہ گزر گیا۔ گھر کا ماحول بدل گیا۔ ہر طرف خوشیاں ہی خوشیاں پھیل گئیں۔ قہقہے بکھر گئے۔ تاریکیاں روشنیوں میں بدل گئیں۔ ہر طرف اجالا پھیل گیا۔ اس اجالے میں وہ دونوں کتنے خوش تھے۔

عورت : کہاں ہو ؟

مرد : یہاں !

عورت : یہاں — کہاں ؟

مرد : اوپر والے کمرے میں۔

عورت : بیلیں دیوار پر چڑھا دیں ؟

مرد : ہاں — وہی باندھ رہا ہوں۔

عورت : میں یہ نیچے کے دونوں کمرے درست کر چکی ہوں۔

مرد : بڑی تصویر کدھر لگائی ہے ؟

عورت : نیچے آ کر دیکھ لو۔

(میوزک)

مرد : کمال کر دیا ہے۔

عورت : پسند ہے نا ؟

مرد : بہت۔

عورت : یہ شیر کا منہ دیکھا ؟
مرد : کیسے خوفناک دانت ہیں۔
عورت : مر کر بھی غصہ نہ گیا۔
مرد : جنگل کا بادشاہ ہے۔
عورت : ہاں ! جنگل کا بادشاہ !
مرد : اس کمرے کی دیوار پر کچھ اور ہونا چاہیے۔
عورت : کیا ؟
مرد : ہرن کا سر
عورت : ہاں معصوم اور بھولا۔
مرد : شکار کو چلیں گے تو شاید قابو آجائے۔
عورت : اب کے میں بھی چلوں گی۔
مرد : ہاں دونوں چلیں گے۔
عورت : پہلی گولی میں چلاؤں گی۔

(گولی چلنے کی آواز)

راوی : شکار کا شوق بڑھا۔ شکار کھیلا جانے لگا۔ جنگل شکار سے بھرا پڑا تھا۔ اب دور دور سے بھی شکاری آنے لگے۔ ہرن بنتے اور شیر کا شکار کرتے۔ لوگ زیادہ آنے لگے۔ چہل پہل بڑھ گئی۔ اس گھر کے کمرے لوگوں کو رہنے کے لیے دیئے جانے لگے شکار کرتے، کھالیں بیچتے، دنوں میں دولت گھر کی باندی ہو گئی۔ گھر، خوب صورت سرائے میں بدل گیا۔ نوکر چاکر سبھی کچھ آرام و آسائش کے لیے میسر تھا۔ شکار، جو پہلے ایک ہابی تھا اب یہ

تفریحی مشغلہ روزگار بن گیا۔ شکاریوں کے ساتھ شکار کے لیے کئی کئی دن باہر رہنا پڑتا۔ جدائی کے وقفے لمبے ہونے لگے۔

مرد : تو اجازت ؟

عورت : کب تک کے لیے ؟

مرد : بس ! چند دن۔

عورت : نہیں ! .....

مرد : لو ، یہ کیا بات ہوئی ؟

عورت : پتہ نہیں۔ جی گھبراتا ہے۔

مرد : ہمت سے کام لو۔

عورت : آنکھ پھڑک رہی ہے۔

مرد : فضول وہم ہے۔

عورت : پتہ نہیں۔

مرد : گھبراؤ نہیں۔ اچھا۔ تو.....

عورت : اسی کھڑکی سے دیکھتی رہوں گی۔

مرد : ہاں۔ دُور سے مَیں آتا ہوا دکھائی دوں گا۔

عورت : تم جلدی آ جانا۔

مرد : سب کے ساتھ ہی آنا ہے نا۔

عورت : اچھا۔

مرد : خدا حافظ

عورت : جی نہیں مانتا۔

مرد : حوصلہ رکھو۔ خدا حافظ !

عورت : خدا حافظ !

راوی : جب دو ماہ تک شکاری واپس نہ لوٹے تو میری میزبان کی فکر بڑھی - وہ ہر روز اوپر کمرے کی کھڑکی سے باہر جھانکتی رہتی - کئی لوگوں کو اِدھر اُدھر بھیجا، تاکہ معلوم کریں۔

آخر ایک دن دُور سے آتے ہوئے شکاری دکھائی دیے۔ اس دن بیگم نے گلابی رنگ کے کپڑے پہن رکھے تھے - آج خلافِ معمول وہ جلدی جلدی سیڑھیاں اتر کر سڑک پر استقبال کے لیے آگئی تھی۔

لیکن — جب سب لوگ واپس آئے تو کچھ اور ہی سماں تھا۔ اس نے شوہر کو جب پہلی بار دیکھا تھا تو وہ آرزوؤں اور ارمانوں کے رنگ میں ڈوبا ہوا تھا۔

لیکن — اِس وقت جو سُرخی اس کے چہرے اور جسم پر جمی تھی یہ اس کے جمے ہوئے خون کی تھی —

شکار کرتے ہوئے اس نے شیر پر گولی چلائی —
لیکن — موت — شکاری کی قسمت میں لکھی تھی۔
اس کے ساتھی اس کے شوہر کی لاش اٹھا کر
لائے تھے۔
بیگم سکتے میں آگئی تھی۔
رات ہو گئی ہے۔

میری میزبان نے کھڑکی بند کر دی ہے اور ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ شب بخیر کہہ کر چلی گئی ہے۔

مَیں حیران ہوں کہ اتنے عرصے سے موت کا پتہ لگ جانے کے بعد بھی ہر روز کھڑکی کھول کر کیوں انتظار ہوتا ہے۔

میرے کئی بار پوچھنے پر اس نے مسکرا کر کہا:

"یہ میرا وعدہ ہے!"

(موسیقی)